رسول اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):

امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):

امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

خود پڑھیں۔
دوسروں کو تحفہ
میں دیجیں!

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042

maktaba@tanzeem.org

ربیع الثانی ۱۴۴۳ھ

نومبر ۲۰۲۱ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تیس دجّال، دجّالی فتنہ اور دجّالِ اکبر

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

جلد : 70

شمارہ : 11

ربیع الثّانی : 1443ھ

نومبر : 2021ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِتعاون: 400 روپے

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مُدیر

حافظ عاکف سعید

مجلسِ ادارت:

ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

ادارتی مُعاوِن:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ——— 5

ثنائے خواجہ — ایوب بیگ مرزا

تذکّر و تدبّر ——— 9

تیس دجّال، دجّالی فتنہ اور دجّالِ اکبر — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بیانُ القُرآن ——— 43

سورۃ الحدید (آیات ۲۵ تا ۲۹) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

انوارِ ھدایت ——— 62

ذکر اللہ کی فضیلت اور حقوق العباد کی سنگینی — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نقوشِ سیرت ——— 67

"رحمۃ للعالمین" حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم — احمد علی محمودی

حسنِ معاشرت ——— 73

ہماری زبان، ہماری پہچان — مولانا عبدالمتین

علومِ قرآنی ——— 79

علمِ تفسیر کے مآخذ — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

❁❁❁

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ثنائے خواجہ

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ سیاسی اور عسکری لحاظ سے غالب قوتوں کی تہذیب بھی مغلوب قوم پر اپنا زبردست اثر اور گہری چھاپ رکھتی ہے۔ آج دنیا پر مغربی تہذیب چھا چکی ہے۔ اچھا یا بُرا ہونا' جائز یا ناجائز ہونا الگ بات ہے' لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں۔ آج مغرب میں مدرز ڈے' فادرز ڈے' وومین ڈے اور نہ جانے کون کون سے ڈے منائے جاتے ہیں۔ مشرق میں عوام ہی نہیں مذہب اور اس کے علمبردار بھی اِن سے متاثر ہوئے' حالانکہ جس مذہب کی یہ تعلیمات ہوں کہ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے اور جس بیٹے سے باپ راضی اُس سے اللہ راضی' اُس مذہب کے پیروکاروں کے لیے ایسے ڈے کیا اہمیت اور کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اثر پذیری کی انتہا ملاحظہ ہو کہ جس ہستی کو مسلمان محبوب سبحانی کہتے ہیں' جنہیں اللہ تعالیٰ رحمۃ للعالمین کا درجہ دیتا ہے' جس ہستی کے سینہ مبارک کو اللہ رب العزت قرآن پاک کے نزول کے لیے منتخب فرماتا ہے' اُس کی سیرت کے فضائل بیان کرنے کے لیے اکثر و بیشتر ماہ ربیع الاوّل میں ہی قلم اُٹھتے اور لب کھلتے ہیں۔ اخبارات اور جرائد میں مضامین لکھے جاتے اور تقاریب منعقد کی جاتی ہیں۔

آج کی مادی دنیا میں یہ بھی غنیمت ہے وگرنہ حضور ﷺ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا تو ربیع الاوّل کیا اور ربیع الثانی کیا' کوئی ماہ' دن' وقت اور گھڑی ایسی نہیں ہوتی کہ ہم آپ ﷺ پر درود بھیج کر آپ ﷺ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کر کے اپنی دنیا اور آخرت نہ سنوار سکیں! البتہ حال ہی میں ایک بزرگ کی زبان سے یہ سن کر قلم تھر تھر کانپ رہا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی انسان دنیا کی کسی بھی زبان میں آپ ﷺ کی ثنا خوانی کرے' آپ ﷺ کی صفات و کمالات بیان کرے' ممکن نہیں کہ اس کا حق ادا کر سکے کیونکہ شدید خطرہ لاحق رہتا ہے کہ انسان کی محدود سوچ اور تحریر و تقریر کی محدود صلاحیت سے کہیں کوئی توہین کا پہلو نہ نکل

آئے۔ ہماری رائے میں یہ بات بالکل درست ہے' اس لیے کہ غالب جیسا زبان دان اور قادر الکلام یہ کہہ کر ہتھیار ڈال دیتا ہے کہ: ؎

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

''غالب اللہ کے رسول ﷺ کی تعریف اور اُن کی صفات کا ذکر اللہ پر ہی چھوڑتے ہیں اس لیے کہ محمد ﷺ کا کیا درجہ اور مرتبہ تھا' یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے۔''

اور کسی بزرگ شاعر نے ان الفاظ میں بھی حقیقت کا اظہار کرنے کی کوشش کی ہے: ؎

ہزار بار بشویم دہن بہ مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی است

''اگر ہم اپنا دہن (منہ) ہزار بار مشک و گلاب سے دھولیں تب بھی آپ کا نام لینا بے ادبی ہے۔''

کس شجر کی شاخ سے بنے گا وہ قلم اور کیسے میسر آئیں گے وہ الفاظ جو آپ ﷺ کے اوصافِ حمیدہ کا احاطہ کر سکیں! —— طائف میں سخت ترین دن گزار کر خون آلود جوتیوں کو بمشکل پاؤں سے الگ کرتے ہوئے ردِّعمل دینا کہ یہ بستی تباہ نہ ہو' شاید یہاں دین کا کوئی خادم پیدا ہو جائے۔ کوڑا کرکٹ پھینکنے والی بڑھیا کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لے جانا کہ وہ آج اپنا عمل کیوں نہ دہرا سکی۔ فتح مکہ پر حضور ﷺ کی عاجزی کا یہ حال تھا کہ داڑھی کے بال اونٹنی کے کجاوے کی لکڑی سے لگ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے خون کے پیاسوں اور بدترین دشمنوں کو عام معافی دی —— کسی ماہنامہ کے ڈیڑھ دو صفحہ کا بے چارہ اداریہ کس کس ادا کا احاطہ کرے گا؟ درحقیقت یہ ہے وہ انسانیت' یہ ہے وہ بشریت جس کے آگے فرشتوں کے پاس سجدہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا' اگرچہ یہ اللہ ربّ العزت کے حکم سے ہوا' یہ اُسی کے بس کی بات ہے کہ وہ الحکیم' العلیم اور العزیز بھی تو ہے۔ اس بزرگ کے اس صحیح انتباہ کے باوجود سمندر میں پانی کا ایک قطرہ مزید ڈالنے کی کوشش اس لیے کرنی چاہیے تاکہ آئندہ نسلوں کو کچھ نہ کچھ آگاہی حاصل ہوتی رہے۔ پھر یہ کہ اس حوالے سے تحریر و تقریر کے بعد اس پناہ گاہ میں پناہ حاصل کر لینی چاہیے کہ: ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

اُمّتِ مُسلمہ کا المیہ یہ ہے کہ جس طرح ہم قرآن مجید کو چومنے چاٹنے' اسے ریشمی غلاف

میں لپیٹ کر اونچا رکھنے اور زیادہ سے زیادہ محض اس کی ناظرہ تلاوت کرنے کو اپنا کل دینی فریضہ سمجھتے ہیں‘ اسی طرح حضور ﷺ کی ثنا خوانی اور نعت گوئی سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم اللہ کی کتاب کی تکریم کے باوجود اس کو کتابِ ہدایت نہ سمجھیں‘ اسے اپنا امام نہ بنائیں‘ اس کے اوامر و نواہی کا خود کو پابند نہ بنائیں‘ اسی طرح حضور ﷺ کی ثنا خوانی تو کریں لیکن سُنّتِ رسولؐ پر عمل پیرا ہونے سے گریز کریں‘ آپ ﷺ کے مشن کو اپنا مشن نہ بنائیں‘ تو کیا ہم اللہ اور رسول ﷺ کو راضی کر سکیں گے؟ بلکہ یہ کہہ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ کیا اللہ کے غضب سے بچ سکیں گے اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے حق دار قرار پا سکیں گے؟ بلاتشبیہ عرض کیے دیتے ہیں کہ حضور ﷺ کی ذات تو بڑی اعلیٰ و ارفع ہے‘ چہ نسبت خاک را با عالم پاک‘ کیا ایک عام شریف النفس انسان بھی پسند کرے گا کہ کوئی اس کی تعریف و توصیف تو بہت کرے لیکن طرزِ زندگی بالکل مختلف رکھے؟ اس کی پسند اور ناپسند کا قطعی کوئی لحاظ نہ کرے اور خود کو اس کی تعلیمات کا پابند نہ سمجھے۔ جس ذات بابرکت کے بارے میں خالقِ کائنات اور مالک ارض و سماء کا یہ ارشاد ہو: وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ وہ انسانوں کی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے اور نجات بھی اسی میں مضمر ہے کہ زبان درود و ثنا سے تر ہو اور انسان عمل سے پہلے دیکھے کہ نبی ﷺ کی سنت کیا ہے‘ حدیث رسولؐ کیا ہے! باقی سب ہیچ ہے۔

آج اُمّتِ مُسلمہ خصوصاً ہم پاکستانی ایک ایسے نظام میں جکڑے گئے ہیں جو استحصالی ہے۔ استعمار کے ایجنٹوں نے انسانوں کی گردنوں پر پنجے گاڑھے ہوئے ہیں۔ اس باطل نظام نے انسان کے منہ کو انسان کا خون لگا دیا ہے۔ لہٰذا سیاسی سطح پر ظلم ہے‘ جبر ہے‘ درندگی اور وحشت ہے۔ ہمارے معاشی نظام کی بنیاد ہی سود پر ہے جو کہ حرام مطلق ہے‘ اور یہ استحصالی نظام ہے جس کی وجہ سے غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہو رہا ہے۔ معاشرتی سطح پر عدم مساوات ہے‘ عریانی اور بے حیائی ہے۔ قرآن نے انسان کو عدل و قسط پر مبنی جو نظام دیا‘ جسے حضور ﷺ نے اپنے صحابہؓ کی مدد سے قائم و نافذ کیا‘ وہ عملاً آج قریباً متروک ہو چکا ہے۔ اگر آج کوئی نعت خواں کسی ظالم و جابر حاکم کے مرمریں محل میں نعتِ رسول ﷺ پیش کرے اور داد پائے تو اگرچہ ہم فتویٰ دینے کی پوزیشن میں نہیں لیکن عقل سلیم کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اسے دین کے ساتھ کھلا مذاق سمجھیں۔ ہمارا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ ہم عدل و قسط پر مبنی اس نظام کو قائم کرنے کے لیے تن من

دھن کی بازی لگا دیں جس کی خاطر آپ ﷺ مکّہ کی گلیوں میں کانٹوں پر چلے‘ طائف میں سنگ باری برداشت کی‘ حرم میں اونٹ کی اوجھڑی تلے دبے‘ اُحد میں دندانِ مبارک شہید کروائے اور غزوۂ احزاب کے موقع پر پیٹ پر دو دو پتھر باندھے۔ آیئے سیرتِ مبارکہ کے اس حصے پر غور کریں اور سُنّتِ رسول ﷺ کو اپنا کر اسلام کا اجتماعی نظام عدل قائم کریں اور دنیا کو جنت نظیر بنائیں۔ تب ہماری زبان کو زیب دے گا کہ ہم کہیں: ؎

سلام اُس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

تیس دجّال' دجّالی فتنہ اور دجّالِ اکبر

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا ۳ جون ۲۰۰۵ء کا فکر انگیز خطاب' بمقام ہمدرد ہال' راولپنڈی

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ... امّا بعد:

اعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَی الۡاَرۡضِ زِیۡنَۃً لَّہَا لِنَبۡلُوَہُمۡ اَیُّہُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ۝۷ وَاِنَّا لَجٰعِلُوۡنَ مَا عَلَیۡہَا صَعِیۡدًا جُرُزًا ۝۸﴾ (الکہف)

﴿قُلۡ ہَلۡ نُنَبِّئُکُمۡ بِالۡاَخۡسَرِیۡنَ اَعۡمَالًا ۝۱۰۳ اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَہُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ۝۱۰۴﴾ (الکہف)

عَنۡ اَبِیۡ ہُرَیۡرَۃَ ؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: ((لَا تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یُبۡعَثَ دَجَّالُوۡنَ کَذَّابُوۡنَ قَرِیۡبٌ مِّنۡ ثَلَاثِیۡنَ کُلُّھُمۡ یَزۡعُمُ اَنَّہٗ رَسُوۡلُ اللّٰہِ))[1]

عَنۡ اَنَسِ بۡنِ مَالِکٍ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ : ((مَا مِنۡ نَبِیٍّ اِلَّا وَقَدۡ اَنۡذَرَ اُمَّتَہُ الۡاَعۡوَرَ الۡکَذَّابَ' اَلَا اِنَّہٗ اَعۡوَرُ وَاِنَّ رَبَّکُمۡ لَیۡسَ بِاَعۡوَرَ وَمَکۡتُوۡبٌ بَیۡنَ عَیۡنَیۡہِ ک ف ر))[2]

عَنۡ عِمۡرَانَ بۡنِ حُصَیۡنٍ ؓ قَالَ سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوۡلُ : ((مَا بَیۡنَ خَلۡقِ آدَمَ اِلٰی قِیَامِ السَّاعَۃِ خَلۡقٌ اَکۡبَرُ مِنَ الدَّجَّالِ))[3]

میری آج کی گفتگو کا عنوان ہے ''تیس دجّال' دجّالی فتنہ اور دجّالِ اکبر''۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ ''دجّال'' کے معنی کیا ہیں۔ عربی میں دجل مکر و فریب' دھوکہ اور ملمع سازی وغیرہ کو کہتے ہیں۔ جیسے پیتل کے برتن پر سونے کا پانی چڑھا دیا جائے تو وہ سونے کا بنا ہوا لگتا ہے' یعنی سونے کے پانی نے پیتل کو چھپا لیا۔ اسی طرح تانبے کے برتن کے اوپر

چاندی پھیر دی جائے تو وہ چاندی کا لگتا ہے۔ گویا کہ اس چاندی نے اس کے تانبا ہونے کو چھپا لیا۔ یہ ہے دجل۔ یا انسان کا اپنے بارے میں ایسا دعویٰ کرنا جو حقیقت پر مبنی نہ ہو' یہ دجل و فریب ہے۔

قرآن' حدیث اور فتنۂ دجّال

دوسری بڑی اہم بات یہ جان لیجیے کہ دجّالی فتنے کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے اور حدیث شریف میں بھی ہے۔ البتہ لفظ ''دجّال'' پورے قرآن میں کہیں نہیں آیا' بلکہ دجل کے مادے سے کوئی ایک لفظ بھی قرآن میں نہیں آیا' البتہ احادیث نبویہؐ سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دجّالی فتنے سے بچنے کے لیے سورۃ الکہف کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ آپ ﷺ سے یہ بھی منقول ہے کہ جو شخص ہر جمعہ کو سورۃ الکہف پڑھے گا وہ دجّال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔ احادیث میں سورۃ الکہف کی ابتدائی اور آخری آیات کی خصوصی فضیلت بھی بیان ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے دجّال اور دجّالیت کا ایک تذکرہ ہے از روئے قرآن' اور ایک تذکرہ ہے از روئے حدیث۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ جیسے سود دو قسم کے ہیں۔ ایک ہے ''ربا النسیئۃ'' کہ کسی رقم کو ادھار دینے پر اُس مہلت کے بدلے سود لینا' جس کا قرآن میں بطور ''ربا'' ذکر ہے۔ جبکہ ایک سود کا ذکر حدیث میں ہے جسے ''ربا الفضل'' یا ''ربا الحدیث'' کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے چھ چیزیں معیّن کر دیں کہ ان کا ایک دوسرے سے اگر تبادلہ کرنا ہو تو بالکل برابر کی مقدار میں کیا جائے' (یدًا بیدٍ)۔ یہ چھ چیزیں ہیں: سونا' چاندی' گندم' جَو' کھجور اور نمک۔ مثلاً کھجوروں میں ایک گھٹیا کھجور ہے اور ایک بڑھیا کھجور ہے۔ اب کوئی کہے کہ آپ مجھے دو کلو گھٹیا کھجور دیں' مَیں اس کے بدلے ایک کلو بڑھیا کھجور دیتا ہوں تو یہ حرام ہو جائے گا' یہ سود ہے۔ ہاں' گھٹیا کو درہم یا دینار کے عوض بیچو اور اس سے بڑھیا خریدو! اس لیے کہ یہ بات معیّن نہیں ہو رہی کہ گھٹیا کھجور کی کتنی مقدار برابر ہو گی بڑھیا کھجور کے' لہٰذا اس میں گھپلے کا امکان ہے۔ اسی طرح گندم اور دوسری کھانے پینے کی چیزوں کا معاملہ ہے۔

اسی طرح ایک دجّال اور دجّالیت کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور ایک دجّال اور

دجّالیت کا ذکر حدیث میں ہے‘ اس کو علیحدہ علیحدہ سمجھ لیجیے۔ قرآن مجید کی رو سے اصل دجّال یہ دنیا ہے۔ یہ دنیا ہمیں اپنے اندر گم کر رہی ہے۔ ہمیں آخرت یاد نہیں ہے‘ حالانکہ ہمارا اصل گھر وہ ہے۔ جیسے کوئی مسافر کسی کام کے سلسلے میں راولپنڈی سے کراچی جائے‘ جبکہ اُس کے اہل وعیال راولپنڈی میں ہوں‘ اور اسے واپس آنا تھا‘ لیکن وہاں جا کر اُسے کوئی ایسی دلچسپی مل گئی کہ اس میں گم ہو گیا۔ تو یہ گویا دجل ہے کہ وہاں کی چمک دمک نے اسے مبہوت کر کے رکھ دیا اور اپنے اندر جذب کر لیا۔ وہ گھر والوں کو بھول گیا کہ میرے بچے کہاں ہیں‘ میرا گھر کہاں ہے۔ اسی طرح ہم اصل میں عالَمِ امر کے مسافر ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۱۵۶﴾ (البقرۃ) ہم اللہ ہی کے پاس سے آئے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ البتہ ہمارا خاکی وجود زمین سے آیا ہے اور یہ زمین ہی میں لوٹ جائے گا۔ ارشادِ ربّانی ہے: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝۵۵﴾ (طٰہٰ) ’’اسی (مٹی) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں ہم تمہیں لے جائیں گے (تم دوبارہ مٹی میں مل کر مٹی ہو جاؤ گے) اور پھر اسی میں سے ہم تمہیں دوبارہ نکال لائیں گے‘‘۔ اب یہ جو تھوڑا سا وقت آیا ہے جس میں ہمارا عالمِ ارواح اور اِس عالمِ مادی کا سفر جڑ گیا ہے‘ یعنی ماں کے پیٹ سے پیدائش کے بعد سے لے کر قبر کے پیٹ میں اترنے تک‘ اگر ہم اسی کو اصل زندگی سمجھ بیٹھیں تو مارے گئے! ہماری اصل زندگی تو کچھ اور ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۴﴾ (العنکبوت)

’’اور یہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور یقیناً اصل زندگی آخرت کی ہے‘ کاش کہ انہیں معلوم ہو جائے!‘‘

اس حقیقت کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ تین گھنٹے کا ایک ڈرامہ ہوتا ہے جس میں کسی کو بادشاہ کا کردار دے دیا جاتا ہے‘ اسے اعلیٰ کپڑے پہنائے جاتے ہیں‘ اس کے سر پر تاج رکھا جاتا ہے۔ وہ گویا تین گھنٹے تک بادشاہ ہے۔ اسی طرح اُس ڈرامے میں کسی

کو فقیر بنا دیا جاتا ہے‘ اسے پھٹے پرانے کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور وہ گویا تین گھنٹے تک فقیر ہے۔ جب ڈرامہ ختم ہوتا ہے تو نہ بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے نہ فقیر فقیر ہوتا ہے۔ بادشاہ سے وہ شاہانہ لباس‘ وہ سنہری قبا اور تاج واپس لے لیا جاتا ہے۔ اب وہ محض ایک ایکٹر کا ایکٹر رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی وہ فقیر بھی کوئی حقیقی فقیر نہیں تھا۔ یہی حقیقت اس زندگی کی ہے‘ جبکہ اصل زندگی آخرت کی ہے۔

آخرت کی زندگی اصل کس اعتبار سے ہے‘ اس کا میں تجزیہ کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔ اس دنیا میں تین دجّال ہیں۔ ایک دجال ہے یہ کائنات بمقابلہ خالقِ کائنات۔ ہم خالق کو بھول گئے‘ اس کائنات میں منہمک ہو گئے۔ اسی کو دیکھ رہے ہیں‘ پڑھ رہے ہیں‘ لکھ رہے ہیں‘ تجربات کر رہے ہیں کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔ یہ کائنات دجّال بن گئی ہے‘ دجل بن گئی ہے اللہ سے بھلانے کے لیے۔ دوسرا دجّال ہے جسم بمقابلہ روح۔ روح کو ہم بھول گئے‘ البتہ جسم کی ہمیں فکر ہے۔ جسم کھانے کو مانگتا ہے تو دوڑتے ہیں‘ کھانا کھاتے ہیں۔ آنکھ میں کوئی پھنسی نکل آئے تو ڈاکٹروں کے پاس دوڑتے ہیں۔ دانت میں درد ہو جائے تو رات کو دو بجے جا کر ڈاکٹر کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ ہمیں اپنے جسم کی اتنی فکر ہے جبکہ روح کی فکر بالکل نہیں ہے۔ روح کا تو پتا ہی نہیں ہے کہ ہے بھی یا نہیں! تو یہ جسم روح کے لیے حجاب بن گیا‘ پردہ اور آڑ بن گیا‘ اوٹ بن گیا‘ دجّال بن گیا۔ تیسرا دجّال آخرت کے مقابلے میں یہ عالمِ دنیا ہے۔ یہ تین دجّال ہیں۔

فتنۂ دجال کے تناظر میں سورۃ الکہف کی اہمیت

اب دیکھئے سورۃ الکہف اس کا علاج کیوں ہے؟ آخر کوئی وجہ تو لازماً ہے! یہ اہم ترین بات ہے جو میں آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ احادیث میں دجال کی جو صفات اور کردار آیا ہے پوری سورۃ الکہف میں اس کا کہیں تذکرہ ہی نہیں۔ تو میں دراصل پہلے قرآن کی رو سے جو دجّال ہے اس کو سمجھانا چاہتا ہوں‘ پھر حدیث کی رو سے دجال کی وضاحت کروں گا۔ سورۃ الکہف میں یوں سمجھئے کہ دو بانس (poles) گاڑ دیے گئے‘ ایک پہلے رکوع میں اور ایک آخری میں۔ ان پر ایک ڈور باندھ دی گئی اور اس ڈور میں تین چار مقامات پرو

دیے گئے۔ شروع میں ہے: ﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا﴾ (آیت ۷) ''ہم نے زمین پر جو کچھ ہے اسے اس کا زیور بنا دیا ہے''۔ کیا ہی دل کو لبھانے والا' دل کو کھینچنے والا زیور ہے! کہیں پر خوبصورت محل بنا ہوا ہے' کیا کہنے اس کے! کیا ٹھکانہ اس کا! کہیں فلک بوس جڑواں ٹاورز بنے ہوئے ہیں' جنہیں دیکھنے کے لیے ٹوپی گرانی پڑتی ہے۔ تو جو کچھ زمین پر ہے زمین کی آرائش و زیبائش ہے۔ ﴿لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝۷﴾ ''تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ کون اُن میں سے اچھے عمل کرتا ہے''۔ ﴿وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝۸﴾ ''اور یقیناً جو کچھ اس زمین پر ہے اس سب کو ہم بالآخر ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں''۔ اس میں ہم نے تمہارے لیے ایک امتحان رکھا ہے کہ کون اچھے عمل کرتا ہے۔ گویا ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!

یعنی یہ امتحان کہ انسان کی توجّہ اِس دنیا کی طرف رہتی ہے یا ہماری طرف؟ یہ دنیا سے محبّت کرتا ہے یا ہم سے؟ لیکن یہ تو دنیا میں گم ہو گیا ہے۔ ہمیں تو یہ بھول گیا ہے! ہماری طرف تو اِس کی توجّہ ہی نہیں ہے! چوبیس گھنٹے کی سوچ دنیا کے لیے ہے' دن رات کی بھاگ دوڑ دنیا کے لیے ہے۔ تو فرمایا: ﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا﴾ کہ یہ سب کچھ تو زمین کی زینت ہے' اس کا بناؤ سنگھار ہے۔ قرآن ایک اور جگہ فرماتا ہے کہ زمین بنجر پڑی ہوئی تھی' بے آب و گیاہ تھی' بارش ہوئی تو اب وہاں سبزہ اُگ آیا ہے۔ اسے ''اَلزِّيْنَة'' کہا گیا ہے کہ اب زمین سنگھار کر رہی ہے۔ جھاڑیوں میں نئے نئے پتے آ گئے ہیں' یہ زمین کا گہنا اور زیور ہیں' زمین کا بناؤ سنگھار ہیں۔ یہ سب کچھ اس غرض سے پیدا کیا گیا ہے ﴿لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝۷﴾ ''تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون اچھے عمل کرنے والے ہیں۔''

اس ضمن میں ایک نکتہ اور نوٹ کر لیجیے۔ دنیا جتنی زیادہ حسین ہو گی یہ فتنہ اتنا ہی بڑھ جائے گا۔ آج کی دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ آدمی اگر پہلی دفعہ امریکہ جائے تو دنگ رہ جاتا ہے'

اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ ایسی ایسی عالی شان عمارات ہیں' ایسے ایسے پل ہیں' چار چار lanes کی خوبصورت سڑکیں ہیں کہ اِدھر بھی چار اور اُدھر بھی چار۔ گاڑیاں چل رہی ہیں تو بالکل اپنی lane کے اندر' مجال ہے کہ اِدھر سے اُدھر ہو جائیں۔ اگر اِدھر اُدھر ہونا ہو تو کافی دیر پہلے سے indicator دینا پڑتا ہے۔ یہ سارے مناظر دیکھ کر آدمی انہی میں گم ہو جاتا ہے۔ بقول علّامہ اقبال ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

تو دنیا جتنی حسین ہو گی اتنی ہی اپنے آپ کو ہمارے لیے دلکش بنا دے گی' اتنے ہی ہم اس کی طرف کھنچتے چلے جائیں گے' اتنے ہی ہم اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوتے جائیں گے' اس عروسِ ہزار داماد کے عاشق ہو جائیں گے۔ آج یورپ اور امریکہ میں یہ دلکشی بہت بڑھ گئی ہے۔ جسے اقبال کہتے ہیں:

"The glittering exterior of present western civilization."

یعنی ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

اس کی چمک دمک سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں' لیکن درحقیقت اس میں جھوٹے نگ لگے ہوئے ہیں' سچے نہیں ہیں۔

یہ تو ہو گئیں پہلے رکوع کی دو آیات۔ اب آخری رکوع کی دو آیات ملاحظہ کیجیے:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝۱۰۳ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝۱۰۴﴾

''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنی جِدّوجُہدِ زندگی کے اعتبار سے بہت زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ کہ جن کی ساری محنت و مشقّت دنیا کی زندگی ہی کے اندر گم ہو کر رہ گئی اور وہ سمجھتے رہے کہ ہم بڑا اچھا کام کر رہے

ہیں (ہم بڑے کامیاب ہیں)۔‘‘

’’اَخْسَرِیْنَ‘‘ کا مطلب ہے سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے۔ جیسے ’’کَبِیْر‘‘ کا مطلب ہے بڑا اور ’’اَکْبَر‘‘ کا مطلب ہے سب سے بڑا۔ اسی طرح ’’خَاسِرٌ‘‘ سے ’’اَخْسَر‘‘ بنا ہے‘ یعنی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والا۔ تو فرمایا جا رہا ہے کہ اپنی مشقّت کے نتیجے کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے میں رہنے والے وہ لوگ ہیں جن کی ساری محنت و مشقّت دنیا ہی کے اندر گم ہو کر رہ گئی اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم بڑے کامیاب ہیں‘ بہت اچھا کام کر رہے ہیں! دو سال پہلے ہماری صرف ایک ٹیکسٹائل مل تھی اور آج تین ہیں۔ میرا پہلے سادہ سا مکان تھا‘ لیکن آج میں نے کیسا محل بنا لیا ہے! تو وہ سمجھتے ہیں ہم کامیاب ہو رہے ہیں‘ حالانکہ وہ بڑے خسارے میں ہیں۔ تو یہ دو بانس یا ستون ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جو کچھ بنایا وہ بطور زینت بنایا کہ اس سے محبّت کرتے ہو یا اللہ سے؟ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ جو دنیا کی محبّت میں پھنس گئے سب سے زیادہ گھاٹے اور خسارے میں رہنے والے وہی ہیں۔ یہ گویا ایک ستون ہو گیا۔

دوسرا ستون سورۃ الکہف کی آیات ۲۸ اور ۴۶ ہیں۔ آیت ۲۸ میں فرمایا گیا:

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۚ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾

’’اور (اے نبی ﷺ!) اپنے دل کو اُن لوگوں پر مطمئن رکھیے جو اپنے ربّ کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اُسے پکارتے ہیں‘ اور اِن سے (یعنی اپنے ان غریب صحابہؓ سے) ہرگز نگاہ نہ پھیریئے! کیا آپ دنیا کی زینت پسند کرتے ہیں؟‘‘

یعنی اے نبی ﷺ! آپؐ اپنے غریب ساتھیوں سے توجّہ ہٹا کر اُن لوگوں کی طرف نہ دیکھئے جن کو ہم نے دولت دے رکھی ہے‘ ورنہ دیکھنے والا یہ سمجھے گا کہ آپؐ ان کی دولت اور اُن کی حیثیت و وجاہت سے متأثر ہو گئے ہیں۔ آیت ۴۶ میں فرمایا:

﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝﴾

’’یہ مال اور اولاد محض دُنیوی زندگی کی ایک آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تمہارے ربّ کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہترین ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔‘‘

یعنی یہ مال اور بیٹے محض دنیا کی زندگی کی زینت ہیں۔ اِدھر آنکھ بند ہوئی تو نہ مال رہے گا نہ بیٹے رہیں گے۔ یہ تو محض چمک دمک ہے جس میں تم گرفتار ہو۔ سورۃ التغابن میں فرمایا:

﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

’’تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے فتنہ ہیں‘ اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔‘‘

یہاں سورۃ الکہف میں بھی وہی بات ہو رہی ہے کہ دُنیوی زندگی محض آزمائش کے لیے ہے اور باقی رہنے والے تو نیک اعمال ہیں جو تم دنیا میں کرو گے۔ باقی رہا مال تو وہ تو فانی ہے۔ آج آپ کے پاس ہے تو کل کسی اور کے پاس چلا جائے گا اور آپ خالی رہ جائیں گے۔ جوئے میں یہ چیز بہت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے کہ ایک ہار گیا اور دوسرا سارا مال اٹھا کر چل دیا۔ اور یہی کچھ ہو رہا ہے اس عملی زندگی میں کہ مال کسی ایک ہی کے پاس نہیں رہتا۔

حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا قصّہ

اس سورت میں اس حوالے سے ایک قصّہ بیان ہوا ہے جو آیات ۶۰ تا ۸۲ پر مشتمل ہے اور دو رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے‘ جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دنیا میں چیزیں نظر کچھ اور آتی ہیں لیکن حقیقت میں ہوتی کچھ اور ہیں۔ بقولِ غالب ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا!

قصّہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی۔ دونوں کشتی میں سوار ہوئے۔ دورانِ سفر حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کے اندر سوراخ کر دیا۔ حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ معاہدہ یہ ہوا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہیں گے تو میرے کسی کام پر سوال نہیں کریں گے جب تک مَیں خود نہ بتاؤں۔ لیکن حضرت موسیٰؑ جلالی مزاج کے آدمی تھے‘ چپ کیسے رہ سکتے تھے! فرمایا:

﴿اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ﴿۷۱﴾﴾ ''کیا آپ نے اس کشتی میں سوراخ کر دیا تا کہ آپ اس کے تمام مسافروں کو ڈبو دیں؟ یہ تو آپ نے بہت ہی غلط کام کیا'' حضرت خضرؑ نے فرمایا: ﴿اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾﴾ ''مَیں نے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے؟'' اس پر حضرت موسیٰؑ نے معذرت کی۔ پھر آگے چلے تو انہوں نے ایک نوجوان کو قتل کر دیا۔ اس پر حضرت موسیٰؑ جلال میں آ گئے اور فرمایا: ﴿اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾﴾ ''کیا آپ نے بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو' ایک بے گناہ نوجوان کو قتل کر دیا؟ یہ تو آپ نے بہت ہی نامعقول حرکت کی ہے''۔ حضرت خضرؑ نے پھر فرمایا: ﴿اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾﴾۔ ''مَیں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے؟'' اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اب اگر مَیں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیے گا۔ آگے چل کر دونوں ایک بستی میں پہنچے۔ بھوک سے برا حال تھا۔ بستی والوں سے کہا کہ ہم مسافر ہیں ہمیں کھانا کھلاؤ' مگر انہوں نے کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ اب حضرت موسیٰؑ کو بستی والوں پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ دونوں چلتے چلتے ایک دیوار کے پاس سے گزرے جو ٹیڑھی ہو چکی تھی اور گرنے والی تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے مرمت کر کے اسے سیدھا کر دیا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اِن ناہنجار لوگوں نے ہمیں کھانے کو کچھ نہیں دیا اور آپ نے بغیر کسی مزدوری کے ان کے لیے دیوار درست کر دی۔ ﴿لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾﴾ ''اگر آپ چاہتے تو اس پر (اُن سے کچھ) اُجرت لے سکتے تھے''۔ کچھ کھانے کو تو ملتا۔ حضرت خضرؑ نے کہا اب یہ میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا راستہ ہے۔

پھر انہوں نے بالترتیب ان کاموں کی حقیقت بتائی کہ وہ کشتی غریب لوگوں کی تھی' جدھر جا رہی تھی اُدھر آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو ضبط کر رہا تھا۔ میں نے کشتی میں عیب پیدا کر دیا' اب وہ یہ عیب دار کشتی نہیں لے گا۔ اس طرح کشتی تو بچ جائے گی' البتہ اس میں

جو سوراخ ہے اسے بعد میں درست کر لیا جائے گا۔ تو مَیں نے تو بھلائی کی ہے جسے آپ برائی سمجھ رہے تھے۔ اسی طرح وہ نوجوان جسے مَیں نے قتل کیا ہے' اگر وہ بڑا ہوتا تو سرکش ہوتا اور اپنے مؤمن والدین کے لیے ایذا کا موجب بنتا۔ تو ہم نے چاہا کہ ان کو ان کا رب بدلے میں اس سے بہتر اولاد عطا کر دے' لہٰذا مَیں نے اسے قتل کر دیا۔ اور یہ جو گرنے والی دیوار کو میں نے درست کر دیا' یہ دو یتیم بچوں کی ملکیت ہے اور اس کی بنیاد میں اُن کے والد نے جو ایک نیک آدمی تھا' کچھ دولت گاڑ رکھی تھی تا کہ یہ جوان ہو کر نکال لیں۔ اگر وہ دیوار گر جاتی تو ابھی سے وہ دولت نکل آتی اور لوگ اٹھا کر لے جاتے جبکہ وہ دونوں ابھی نابالغ ہیں۔

اور کہا کہ: ﴿وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ﴾ (آیت ۸۲) ''اور مَیں نے یہ اپنے اختیار سے نہیں کیا'' بلکہ یہ اللہ کا حکم تھا۔ یعنی اللہ دنیا میں جس طریقے سے نظام چلا رہا ہے ایک اُس کا ظاہر ہے اور ایک اُس کا باطن ہے۔ تم ظاہری حیثیت سے سمجھ رہے ہو کہ یہ اچھا کام ہے اور یہ برا کام ہے۔ جسے تم برا سمجھ رہے تھے باطن میں اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر رکھا تھا۔ کشتی کو عیب دار کرنے سے کشتی بچ گئی' ورنہ ان مسکینوں کے پاس روزی کمانے کا یہ واحد ذریعہ ختم ہو جاتا' کیونکہ بادشاہ نے اس پر قبضہ کر لینا تھا۔ اسی طرح وہ بچہ جوان ہوتا تو نیک والدین کے لیے سوہانِ روح بن جاتا اور گرتی ہوئی دیوار کو ہم نے اس لیے بچایا کہ وہ دو یتیم بچوں کی تھی۔ ان کا باپ بہت نیک آدمی تھا اور اس نے اپنے بڑھاپے میں موت سے پہلے ان کے لیے کچھ مال جمع کیا تھا جو اِن دونوں کے لیے خزانہ تھا۔ ہم نے یہ چاہا کہ یہ بڑے ہو کر اپنا خزانہ خود حاصل کریں۔

دعائے استخارہ کی تعلیم

اصل بات یہ سمجھانی مقصود ہے کہ دنیا کی چمک دمک اور ہے جبکہ دنیا کی حقیقت کچھ اور ہے۔ دنیا میں پیش آنے والے واقعات بظاہر کچھ دکھائی دے رہے ہوتے ہیں جبکہ پیچھے حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ بظاہر جسے تم خیر سمجھتے ہو حقیقت میں اُس کے اندر شر ہوتا ہے اور جسے تم شر سمجھتے ہو حقیقت میں اُس کے اندر خیر ہوتا ہے' لیکن تم جانتے نہیں۔ اسی لیے

اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دعائے استخارہ ایسے سکھائی جیسے کہ قرآن سکھایا۔ وہ دعائے استخارہ یہ ہے: ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَاَسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ)) ''اے اللہ! میں تیرے علم کی بنیاد پر تجھ سے خیر کا طالب ہوں اور تیری قدرت سے میں بھی کچھ قدرت چاہتا ہوں''۔ مجھے بھی کچھ طاقت اور اختیار عطا فرما۔ ((وَاَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ)) ''اور میں تجھ سے تیرے فضل عظیم میں سے فضل کا سوالی ہوں''۔ ((فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ)) ''یقیناً تُو قدرت رکھتا ہے اور مَیں کوئی اختیار نہیں رکھتا (میں کمزور ہوں)' اور تُو جانتا ہے اور مَیں نہیں جانتا' اور تُو تمام چھپی ہوئی چیزوں کا جاننے والا ہے''۔ ((اَللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاقْدُرْهُ لِیْ وَیَسِّرْهُ لِیْ ثُمَّ بَارِکْ لِیْ فِیْهِ)) ''اے اللہ! اگر تیرے علم کے مطابق میرا یہ معاملہ میرے لیے بہتر ہے میرے دین کے اعتبار سے بھی' میری دُنیوی زندگی کے اعتبار سے بھی اور نتیجے کے اعتبار سے بھی تو اسے تُو میرے لیے طے کر دے اور اسے میرے لیے آسان کر دے' پھر اس میں میرے لیے برکت ڈال دے''۔ ((وَاِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاصْرِفْهُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْهُ)) ''اور اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ یہ معاملہ میرے لیے شر ہے میرے دین کے اعتبار سے بھی' میری دُنیوی زندگی کے اعتبار سے بھی اور نتیجے کے اعتبار سے بھی تو تُو اسے مجھ سے دُور کر دے اور مجھے اس سے دُور کر دے''۔ ((وَاقْدُرْ لِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ کَانَ ثُمَّ اَرْضِنِیْ بِهٖ)) [صحیح البخاری' عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ] ''اور تُو میرے لیے خیر ہی کا فیصلہ کر جہاں کہیں بھی وہ ہو اور پھر مجھے اس پر راضی بھی کر دے۔''

اسی طرح سورۃ البقرۃ میں ہے:

﴿وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾﴾

''اور ہوسکتا ہے کسی چیز کو تم ناپسند کرو اور اسی میں تمہارے لیے خیر ہو' اور

ہوسکتا ہے کسی شے کو تم پسند کرو کرو اور وہی تمہارے لیے شر ہو۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔''

سورۃ الکہف کی اصل ہدایت

اس کے علاوہ سورۃ الکہف میں اصحابِ کہف کا قصّہ بھی نقل ہوا ہے جو آیات ۹ تا ۲۶ پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اہلِ ایمان دنیا کے اندر سخت ترین حالات سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں' جیسے اصحابِ کہف اپنی جان بچانے کے لیے اور اپنی توحید کو بچانے کے لیے غار میں جا کر چھپ گئے اور اللہ نے تین سو برس تک انہیں غار میں سلائے رکھا۔ اور ذوالقرنین کے قصے (آیات ۸۳ تا ۱۰۱) سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو دنیا میں غلبہ اور بادشاہت بھی دے سکتا ہے' جیسے ذوالقرنین کی مشرق و مغرب اور شمال کی فتوحات ہیں۔

اس سورت میں دجّالی فتنہ کے بارے میں ایک اور قصّہ بھی آیا ہے جو آیات ۳۲ تا ۴۴ پر مشتمل ہے۔ یہ ایک اللہ والے درویش اور ایک مادہ پرست کے درمیان مکالمہ ہے جس میں ایک بڑی پیاری اور اہم بات بتائی گئی ہے کہ دنیا میں مادی صلاحیتوں اور مادی قوتوں وغیرہ پر اعتماد کرنا سب سے بڑا شرک ہے۔ دو آدمی تھے۔ ایک کو اللہ نے بہت دولت دی تھی۔ اس کے پاس انگوروں کے دو باغات تھے' جن کے گرد کھجوروں کے درخت باڑ کے طور پر لگے ہوئے تھے۔ آبپاشی کا بہت اعلیٰ نظام تھا اور درمیان میں کھیتی بھی تھی۔ پھر اللہ نے اسے اولاد بھی دے رکھی تھی۔ دوسرا شخص اللہ والا تھا' درویش تھا' اور اس کے پاس دُنیوی اعتبار سے کوئی مال و دولت نہیں تھی۔ دورانِ گفتگو دولت مند شخص درویش سے کہنے لگا: ﴿اَنَا اَکْثَرُ مِنْکَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾﴾ کہ میرے پاس مال بھی تم سے زیادہ ہے اور میری نفری بھی زیادہ ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اپنے باغ میں داخل ہوا جبکہ وہ اپنے نفس پر ظلم کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے ان باغوں اور کھیتی کا ایسا عمدہ بندوبست کر لیا ہے کہ ان پر کبھی کوئی تباہی اور ہلاکت آ ہی نہیں سکتی' اور مجھے کوئی گمان نہیں ہے کہ قیامت بھی وقوع پذیر ہونے والی ہے' اور بالفرض (جیسا تم کہتے ہو) مجھے میرے

ربّ کی طرف لوٹا بھی دیا گیا تو وہ مجھے وہاں بھی یہاں سے بڑھ کر دے گا (اور تم وہاں بھی یہاں کی طرح خالی ہاتھ جوتیاں چٹخاتے پھرو گے)۔

جواب میں اُس درویش نے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم اللہ کا کفر کر رہے ہو جس نے تمہیں مٹی سے بنایا' پھر نطفہ سے بنایا' پھر پورا انسان بنا کر کھڑا کر دیا؟ یہ سارا کچھ اسی کا دیا ہوا ہے۔ کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تُو اپنی جنت میں داخل ہوا تو تیری زبان پر یہ الفاظ آتے: ﴿مَاشَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۳۹) یعنی جو کچھ اللہ چاہے وہی ہو گا' میرا یا کسی کا کچھ زور نہیں ہے' ہمارا اگر کچھ بس چل سکتا ہے تو اللہ کی توفیق و تائید سے چل سکتا ہے۔ لیکن تیرا سارا توکّل' دارومدار اور سارا انحصار مادی اسباب و وسائل پر ہے۔ اگر تُو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کمتر پا رہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا ربّ مجھے تیرے اس باغ سے کہیں بہتر باغ عطا کر دے' اور تیرے اس باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے' یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے اور پھر تُو اسے کسی طرح نہ نکال سکے۔ اُس اللہ والے کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ صحیح ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے باغ اور کھیتی غارت کر دیے۔ قرآن کریم کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

﴿وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾﴾

''اور اُس کا سارا ثمرہ مارا گیا اور وہ اپنے انگوروں کے باغ کو ٹٹیوں پر الٹا پڑا دیکھ کر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور کہنے لگا کہ کاش! میں نے اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا۔''

یہ ہے آج کے دَور کا شرک' یعنی مادّہ پرستی۔ اس پورے رکوع میں کسی دیوی' دیوتا یا بُت کا تذکرہ نہیں ہے' لیکن چونکہ باغ والے کا سارا دارومدار اور توکّل مادّی اسباب و وسائل پر تھا لہٰذا اس نے اعتراف کیا کہ اس کا یہ طرزِ عمل اپنے ربّ کے ساتھ شرک کے مترادف تھا۔

اسی سورۂ مبارکہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ﴾ (آیات ۲۳' ۲۴) ''اور کسی چیز کے بارے میں

کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کروں گا۔ (تم کچھ نہیں کر سکتے) اِلّا یہ کہ اللہ چاہے''۔ فرض کیجیے آپ نے سفر کرنا ہے' آپ نے اپنی گاڑی کی سروس کروالی ہوئی ہے اور تیل کی ٹینکی بھی بھری ہوئی ہے تب بھی آپ کبھی یہ نہ کہیں کہ میں صبح اُٹھ کر سفر پر چل دوں گا۔ اس لیے کہ جب تک اللہ نہیں چاہے گا آپ نہیں جا سکیں گے۔ بلکہ کہیے ''اِن شاء اللہ' میں صبح جاؤں گا''۔ ان شاء اللہ' ماشاء اللہ' سبحان اللہ' الحمدللہ' یہ کلمات ہماری تہذیب کے مظاہر ہیں۔

متذکرہ بالا واقعہ میں اللہ والا شخص دوسرے سے کہتا ہے: ﴿وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۳۹) کہ تم باغ میں داخل ہوئے' تم نے دیکھا بڑا حسین منظر ہے تو تمہیں ''ماشاء اللہ'' کہنا چاہیے تھا کہ اللہ نے جو چاہا وہی ہے' میرے کیے کچھ نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح پیاس لگی ہوئی تھی' پانی پیا اور پیاس بجھی تو کہنا چاہیے ''الحمدللہ'' کہ اللہ نے ہی پانی میں یہ صلاحیت رکھی ہے۔ ایسے ہی نقاہت ہو رہی تھی' کھانا کھایا تو اب جسم توانا ہے تو ''الحمدللہ'' کہنا چاہیے۔ پھول دیکھا تو پھول کی تعریف نہیں بلکہ سبحان اللہ کہنا چاہیے کہ اللہ پاک ہے۔ اصل حسین تو وہ ہے جس نے یہ پھول بنایا ہے۔ تو یہ ہمارے مجلسی کلمات یوں سمجھئے توحید کے خزانے ہیں۔

یہ ہے سورۃ الکہف کی اصل ہدایت کہ دنیا کے بجائے آخرت کو حقیقی منزل سمجھو۔ دنیا کے بجائے آخرت کو اپنا گھر سمجھو۔ دنیا کے بجائے اللہ کو اپنا مقصود و مطلوب مانو! تمہارا ایمان ہونا چاہیے کہ: لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ' لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ' لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ۔ اور بدن سے زیادہ اپنی روح کی فکر کرو۔ یہ ہے دجل کا فلسفہ جو قرآن بیان کرتا ہے۔ اور جس پہلو سے سورۃ الکہف اس فتنے کے توڑ کے لیے مفید ہے وہ میں نے واضح کر دیا۔

دجّال اور دجّالیت —— احادیث کی روشنی میں

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ احادیث نبویؐ میں دجال کس مفہوم میں آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَخْرُجَ ثَلَاثُوْنَ دَجَّالُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ))(۴)

''قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تیس دجّال نہ نکل آئیں۔ اُن میں سے ہر ایک کو یہ زعم ہوگا کہ مَیں اللہ کا رسول ہوں۔''

ایک حدیث میں الفاظ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((وَاِنَّهٗ سَيَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ ثَلَاثُوْنَ كَذَّابُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهٗ نَبِيٌّ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ))(۵)

''اور یقیناً (قیامت کے قریب) تیس جھوٹے پیدا ہوں گے' ان میں سے ہر ایک کو یہ زعم ہوگا کہ مَیں نبی ہوں' حالانکہ مَیں (محمد ﷺ) آخری نبی ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

تیس دجّال وہ جھوٹے نبی ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ چھ سات تو حضور ﷺ کے زمانے میں ہی پیدا ہو گئے تھے جن کے خلاف حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ نے جہاد کیا۔ مسیلمہ کذاب کے ساتھ مقابلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے پانچ سو حُفّاظِ کرام شہید ہو گئے۔ تب فکر پیدا ہوئی کہ قرآن مجید کو کتابی شکل میں مرتب کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن کو مصحف کی شکل میں مرتّب کیا جس کے لیے ''مَابَيْنَ الدُّفَّتَيْن'' کے الفاظ ملتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''میری اُمّت میں سے تیس جھوٹے دجّال اٹھیں گے''۔ ظاہر بات ہے عرب میں جتنے بھی جھوٹے مدّعیانِ نبوت اُٹھے تھے وہ اُمّتِ محمدؐ میں سے ہی اٹھے تھے۔ اس لیے کہ سن نو ہجری کے بعد پورا عرب ایمان لے آیا تھا۔ اُن میں سے سجاح بنت حارثہ نامی ایک عورت بھی تھی جس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ تو ایک ''دجل'' یا ''دجّال'' یہ ہے جس کا حدیث میں ذکر ہے۔

دوسرا دجّال جس کے بارے میں حدیث خبر دیتی ہے وہ ایک انسان ہوگا جو خدا ہونے کا دعویٰ کرے گا۔ اسے قوائے طبیعیہ اور Forces of the Nature پر اور اس کائنات کے عناصر پر مکمل قدرت اور کنٹرول ہوگا۔ وہ کھانے کو اُسی کو دے گا جو اُسے خدا مانے گا' جو نہیں مانے گا اُس کا رزق بند کر دے گا اور اُس کو نہ ماننے والوں کا قتلِ عام کرے گا۔ اہل ایمان کے لیے یہ عظیم ترین امتحان ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ فتنہ اتنا

بڑا ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر قیامت تک کوئی فتنہ اس سے بڑا نہیں ہے۔ حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا بَيْنَ خَلْقِ آدَمَ اِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ خَلْقٌ اَكْبَرُ مِنَ الدَّجَّالِ))(۶)

''آدم (علیہ السلام) کی تخلیق سے لے کر قیامت تک کوئی فتنہ دجّال سے بڑا نہیں ہے۔''

ایک اور حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا وَقَدْ اَنْذَرَ اُمَّتَهُ الْاَعْوَرَ الْكَذَّابَ' اَلَا اِنَّهٗ اَعْوَرُ وَاِنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِاَعْوَرَ وَمَكْتُوْبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ ک ف ر))(۷)

''ہر نبی نے اپنی اُمّت کو اس کانے جھوٹے (دجّال) سے باخبر کیا ہے۔ سنو! یقیناً وہ کانا ہوگا' اور یقیناً تمہارا ربّ ہرگز یک چشم نہیں ہے۔ اور اس (کانے دجّال) کی آنکھوں کے درمیان ''ک ف ر'' لکھا ہوگا۔'' (بعض روایات میں ہے کہ ''کافر'' لکھا ہوگا۔)

یعنی وہ دجّال جو خدائی کا دعویٰ کرے گا وہ یک چشم ہوگا۔ ہمارے ہاں ''کانا دجّال'' مشہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں جب اسرائیل نے یروشلم فتح کر لیا تھا تو اُس وقت اسرائیل کا وزیر دفاع موشے دایان بھی کانا تھا۔ وہ ایک آنکھ کے اوپر پردہ لگائے رکھتا تھا' لہٰذا کچھ لوگوں نے کہا کہ یہی ''کانا دجّال'' ہے۔ بہرحال وہ دجّال جس سے اُمّت کو خبردار کیا گیا ہے' وہ آئے گا تو خدائی کا دعویٰ کرے گا کہ مجھے سجدہ کرو اور مجھے مانو تو تمہیں رزق ملے گا' ورنہ تمہارا دانہ پانی بند کر دیا جائے گا۔ ذرا سوچیے اگر فی الواقع ایک ایسی قادر مطلق شخصیت دنیا میں آ جائے جسے اللہ تعالیٰ خدائی اختیارات دے دے تو ہم میں سے کتنے ہوں گے جو ثابت قدم رہ جائیں گے! یہ سب ہماری آزمائش کے لیے ہوگا کہ دیکھیں پھر بھی ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں یا اُس دھوکے باز کے فتنے میں آ جاتے ہیں۔

دجّال کی صفات

اس دجّال کی صفات کیا ہوں گی وہ جان لیجیے! صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث میں اس دجّال کے الفاظ نقل ہوئے ہیں:

فَاَسِیْرَ فِی الْاَرْضِ فَلَا اَدَعَ قَرْیَةً اِلَّا هَبَطْتُهَا فِیْ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً غَیْرَ مَکَّةَ وَطَیْبَةَ وَهُمَا مُحَرَّمَتَانِ عَلَیَّ کِلْتَاهُمَا (۸)

''پس میں زمین میں گھوموں گا اور دنیا میں کوئی بستی ایسی نہیں ہوگی جس میں مَیں قدم نہ رکھوں چالیس راتوں (یعنی چالیس دن رات) کے اندر' سوائے مکہ اور مدینہ منورہ کے' کیونکہ یہ دونوں مجھ پر حرام ہیں۔''

'کنز العمال' میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَا بَیْنَ حَافِرِ حِمَارِهٖ اِلَی الْحَافِرِ الْآخِرِ مَسِیْرَةُ یَوْمٍ وَلَیْلَةٍ)) ''اُس کے گدھے کے ایک قدم سے دوسرے قدم تک کا درمیانی فاصلہ اتنا ہوگا جتنا فاصلہ انسان ایک دن اور رات کے سفر میں طے کرتا ہے۔'' یہ بھی فرمایا کہ اُس کے دونوں کانوں کے درمیان اسّی ہاتھ کا فاصلہ ہوگا اور کان تیس تیس ہاتھ لمبے ہوں گے۔ ((یُنَادِیْ بِصَوْتٍ لَهٗ یَسْمَعُ مَا بَیْنَ الْحَافَتَیْنِ)) ''وہ لوگوں کو ایسی آواز کے ساتھ پکارے گا کہ مشرق و مغرب کے سب لوگ سنیں گے''۔ ((سُخِّرَتْ لَهُ اَنْهَارُ الْاَرْضِ وَآثَارُهَا)) ''اس کے لیے زمین کی نہریں اور اس کے آثار مسخر کر دیے جائیں گے''۔ ((یَاْمُرُ السَّمَاءَ فَتُمْطِرُ وَالْاَرْضَ فَتُنْبِتُ)) ''وہ آسمان کو (پانی کا) حکم دے گا تو وہ بارش برسائے گا اور زمین کو حکم دے گا تو وہ پیداوار دے گی''۔ کنز العمال ہی کی ایک اور روایت میں الفاظ آتے ہیں' اور یہ الفاظ مسند احمد میں بھی ہیں: ((وَیَمُرُّ بِالْخَرِبَةِ فَیَقُوْلُ لَهَا اَخْرِجِیْ کُنُوْزَکِ فَتَتْبَعُهٗ کُنُوْزُهَا)) ''اور وہ کسی ویران جگہ سے گزرے گا تو اس کو حکم دے گا کہ نکالو اپنے خزانے (یعنی پیداوار نکالو) تو وہ نکال دے گی۔''

اس سلسلے کی ایک متفق علیہ حدیث بھی ہے۔ حضرت رِبعی بن حِراش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت ابومسعود انصاریؓ نے حضرت حذیفہؓ سے فرمایا کہ آپ مجھے دجّال کے بارے میں وہ حدیث سنایئے جو آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((اِنَّ مَعَ الدَّجَّالِ اِذَا خَرَجَ مَاءً وَنَارًا' فَاَمَّا الَّذِیْ یَرَی النَّاسُ اَنَّهَا

النَّارُ فَمَاءٌ بَارِدٌ' وَاَمَّا الَّذِیْ یَرَی النَّاسُ اَنَّهٗ مَاءٌ بَارِدٌ فَنَارٌ تُحْرِقُ' فَمَنْ اَدْرَکَ مِنْکُمْ فَلْیَقَعْ فِی الَّذِیْ یَرَی اَنَّهَا نَارٌ فَاِنَّهٗ عَذْبٌ بَارِدٌ))

''یقیناً جب دجّال آئے گا تو اُس کے ساتھ پانی بھی ہوگا اور آگ بھی ہوگی۔ پس جو لوگوں کو آگ نظر آ رہی ہوگی وہ (درحقیقت) پانی ہوگا (ٹھنڈا اور میٹھا) اور جو لوگوں کو ٹھنڈا پانی نظر آ رہا ہوگا وہ (حقیقت میں) آگ ہوگی جو جلا کر رکھ دے گی۔ پس تم میں سے جس کا بھی سابقہ دجّال کے ساتھ پیش آئے اُسے اس آگ کی طرف جانا چاہیے' یقیناً وہ (حقیقت میں) ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہوگا۔''

ظاہر ہے دنیا تو مادے پر ایمان و یقین رکھتی ہے لہٰذا لوگ تو پانی کی طرف لپکیں گے' لیکن وہ دراصل آگ ہوگی جو جلا کر رکھ دے گی۔

اس کے علاوہ دجّال کو علاج معالجے پر اتنی دسترس حاصل ہو جائے گی کہ وہ مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو درست کر دے گا۔ یعنی وہ معجزہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس تھا وہ بھی اس کے پاس ہوگا' یعنی مُردوں کو زندہ کر دینا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے کے بارے میں قرآن حکیم میں الفاظ آتے ہیں: ﴿وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ﴾ (آل عمران:۴۹) جبکہ مسند احمد میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے دجال کے بارے میں ارشاد فرمایا: ((وَاِنَّهٗ یُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَیُحْیِ الْمَوْتٰی)) ''یقیناً وہ مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو درست کر دے گا اور مُردوں کو زندہ کرے گا۔'' ایک حدیث میں ہے کہ وہ دجّال ایک آدمی کو آرے کے ساتھ چیرے گا اور پھر سی دے گا تو وہ زندہ ہو جائے گا۔

'کنز العمال' میں اس کی ایک اور صفت بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ((وَیُبْعَثُ مَعَهُ الشَّیَاطِیْنُ عَلٰی صُوْرَةِ مَنْ قَدْ مَاتَ)) ''اور اس کے ساتھ ایسے شیاطین (جِنّات) بھی اٹھائے جائیں گے جو اُن لوگوں کی شکل میں ہوں گے جو مر چکے ہیں''۔ ((مِنَ الْآبَاءِ وَالْاُمَّهَاتِ وَالْاِخْوَانِ وَالْمَعَارِفِ)) ''لوگوں کے آباء و اَجداد میں سے' ان کی ماؤں میں سے' ان کے بھائیوں میں سے اور ان کے جان پہچان

کے لوگوں میں سے‘‘۔((فَیَاْتِیْ اَحَدُھُمْ اِلٰی اَبِیْہِ وَاَخِیْہِ فَیَقُوْلُ اَلَسْتُ فُلَانًا؟ اَلَسْتَ تَعْرِفُنِیْ؟)) ’’تو اُن میں سے کوئی آئے گا اپنے باپ اور بھائی کے پاس اور کہے گا کیا مَیں فلاں (تمہارا بیٹا یا بھائی) نہیں ہوں؟ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟‘‘

دجّال کے فتنوں میں سب سے آخری فتنہ آزادیٔ نسواں کا ہوگا۔ کنز العمال اور مسند احمد کی حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((آخِرُ مَنْ یَخْرُجُ اِلَیْہِ النِّسَاءُ حَتّٰی اِنَّ الرَّجُلَ لَیَرْجِعُ اِلٰی حَمِیْمِہٖ وَاِلٰی اُمِّہٖ وَابْنَتِہٖ وَاُخْتِہٖ وَعَمَّتِہٖ فَیُوْثِقُھَا رِبَاطًا مَخَافَۃَ اَنْ تَخْرُجَ اِلَیْہِ))

’’سب سے آخر میں جو دجّال کی پیروی کے لیے گھروں سے باہر آئیں گی وہ خواتین ہوں گی‘ یہاں تک کہ ایک بندۂ مؤمن (کے پاس صرف یہی ایک چارہ ہوگا کہ وہ) جائے گا اپنی بیوی کے پاس‘ اور اپنی ماں کے پاس‘ اور اپنی بیٹی کے پاس‘ اور اپنی بہن کے پاس‘ اور اپنی پھوپھی کے پاس اور انہیں رسیوں سے جکڑ دے گا‘ اس اندیشے کے تحت کہ کہیں وہ دجّال کی پیروی میں گھروں سے باہر نہ آ جائیں۔‘‘

فتنۂ دجّال کا ظہور اور دجّالِ اکبر کی آمد

اس دَور میں مذکورہ بالا ساری علامات ظاہر ہو چکی ہیں اور یہ فتنہ رونما ہو چکا ہے۔ البتہ اس ضمن میں مَیں دو چیزوں کا فرق کروں گا۔ ابھی وہ معیّن شخص یعنی دجّالِ اکبر نہیں آیا لیکن اس فتنے کی حیثیت سے اُن چیزوں کا ظہور ہو چکا ہے جو مذکورہ بالا احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں:

"The coming events cast their shadows before."

کہ آنے والے واقعات اپنا سایہ پہلے سے ڈال دیتے ہیں۔ نظر آ جاتا ہے کہ کیا آنے والا ہے۔ تو دجّالِ اکبر کے لیے فضا ہموار ہو چکی ہے اور وہ سارے کام ہو رہے ہیں جن کا احادیث میں تذکرہ ہوا ہے۔ حدیث میں اس کی سواری کے لیے ’’حمار‘‘ کا لفظ آیا ہے۔ یہ آج کا جہاز ہے جو بہت تیز رفتاری سے جاتا ہے اور اس کے ریڈارز اس کے کان ہیں جن سے وہ سنتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے بہت زیادہ فاصلے پر ہوتے ہیں۔ حدیث

میں کہا گیا ہے کہ ’’اس کے گدھے کا ایک قدم اگر مدینہ میں ہوگا تو دوسرا یروشلم میں ہوگا‘‘۔ جہاز بھی مدینہ منورہ سے بیت المقدس تک کا فاصلہ بمشکل ایک گھنٹے میں طے کر لیتا ہے۔ حدیث میں ’’اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً‘‘ کے الفاظ آئے ہیں کہ دجّالِ اکبر چالیس راتوں میں پوری دنیا کی ایک ایک بستی میں گھوم جائے گا۔ دنیا کا صرف ایک چکر لگانا ہو تو جہاز کے ذریعے ایک دن میں لگایا جا سکتا ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ ’’وہ ایسی آواز میں بات کرے گا کہ مشرق و مغرب کے سب لوگ سنیں گے‘‘۔ آج صدر بش کی تقریر ہر شخص گھر میں بیٹھا سن رہا ہوتا ہے اور پوری دنیا میں اس کی آواز پہنچ رہی ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ ’’وہ آسمان سے کہے گا بارش برساؤ تو وہ برسائے گا‘‘۔ آج کیا مصنوعی بارشیں نہیں ہو رہی ہیں؟ ’’آج آپ دوبئ جا کر دیکھئے کہ کیا باغ و بہار ہے‘ کتنا سبزہ اُگ رہا ہے اور کتنے درخت اگا لیے گئے ہیں! ابوظبی کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک ایسے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاید ایبٹ آباد یا کاغان کے علاقے میں گھوم رہے ہیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے۔ حالانکہ وہ سڑک کے ساتھ ساتھ سبزے کا ایک پشتہ سا ہے اور پشتے کے پیچھے ریت ہی ریت ہے‘ لیکن گاڑی میں بیٹھے لوگوں کو وہ ریت نظر نہیں آ سکتی۔ یہ ابوظبی کی ساحلی شاہراہ ہے‘ اسے دیکھ کر نگاہیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ میں نے امریکہ میں بھی کوئی ایسا آراستہ و پیراستہ ساحل نہیں دیکھا‘ حالانکہ میں نے اس کا مشرقی ساحل بھی پھرا ہے اور مغربی ساحل بھی۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ سعودی عرب کے اندر گندم پیدا ہو رہی ہے۔ ایک وقت میں یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ سعودی عرب گندم برآمد کرے گا۔ جدّہ سے ریاض آتے ہوئے آپ بڑے بڑے سبز دائرے دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آب پاشی کے لیے مصنوعی طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ ایک لمبا سا فوارہ چلتا ہے اور اس میں سے پانی بارش کی طرح برستا ہے۔ وہ فوارہ چونکہ دائرے میں چلتا ہے تو ایک دائرے کی شکل میں ہریالی ہوتی ہے۔

دیکھئے علاج اب کیسے کیسے ہو رہے ہیں! ٹی بی اور کئی دوسری بیماریوں کا دنیا سے وجود قریباً ختم کیا جا چکا ہے۔ آگے ہو سکتا ہے کوڑھی اور مادرزاد اندھے کا علاج بھی ممکن

ہوجائے۔ رہا ''آدمی کو چیر کر مُردہ کو زندہ کرنا'' تو اس کے لیے کلوننگ کا طریقہ آ گیا ہے۔ اگرچہ انسانی کلوننگ کی ابھی اجازت نہیں دی جارہی لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ حیوانی کلوننگ میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اسی طرح انسانی کلوننگ بھی مشکل نہیں رہے گی۔ بس مُردے کے جسم سے ایک سیل (cell) چاہیے ہوگا جس سے پورا انسان وجود میں آ جائے گا۔

اسی طرح یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''دجّال کے ساتھ ایسے جِنّات (شیاطین میں سے) بھی اٹھائے جائیں گے جو اُن لوگوں کی شکل میں ہوں گے جو مر چکے ہوں گے'' تو اس حوالے سے دیکھئے کہ آج ایسی سوسائٹیز بنی ہوئی ہیں جہاں روحوں کو بلایا جاتا ہے۔ یعنی دھوکہ دینے کے لیے جِن اور شیطان آتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو متعارف کراتے ہیں کہ مَیں تمہارا باپ ہوں، تم مجھے پہچانتے کیوں نہیں؟ تم میری آواز کیوں نہیں پہچانتے؟

اسی طرح آخری فتنہ ہوگا ''عورتوں کی آزادی'' (Liberation of Women) جس کے لیے قاہرہ کانفرنس اور بیجنگ کانفرنس کے بعد بیجنگ پلس فائیو کانفرنس بھی ہو چکی ہے کہ عورت کو مکمل آزاد کرو، یہاں تک کہ اگر وہ جسم فروشی (prostitution) کا پیشہ اختیار کرنا چاہے تو بھی اسے برا نہ کہو۔ بلکہ:

"She will be called a sex worker, not a prostitute."

جیسے مرد حضرات اپنی جسمانی طاقت استعمال کر کے پیسہ کماتے ہیں اسی طرح ایک عورت نے بھی اپنے جسم کا ایک حصّہ استعمال کیا ہے اور اس کے بدلے میں وہ پیسہ لے رہی ہے! اس کے علاوہ اس نے اور کیا کیا ہے؟ پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم جنس پرستی (Homo sexuality) کو بھی نارمل طرزِ عمل سمجھو۔ یہ غیر فطری اور ابنارمل معاملہ نہیں ہے۔ چنانچہ مغرب میں ایک ہی جنس کے افراد کی شادیاں قانونی شمار ہو رہی ہیں۔ برطانیہ میں یہ قانون موجود ہے۔ امریکہ کے شہر کیلیفورنیا میں ایسی شادیاں قانون کے دائرے کے اندر ہو رہی ہیں۔ سان فرانسسکو میں تو میلہ لگ گیا تھا اور ہزاروں ایسی شادیاں ہوئیں۔

رزق کے حوالے سے دیکھئے کہ اس وقت دنیا کی ساری مالیات کا کنٹرول یہودیوں کے ہاتھ میں جا رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے۔ ملکوں کے مابین

فاصلے ختم ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب انفارمیشن ٹیکنالوجی (I.T) کا دَور ہے۔ پرویز مشرف صاحب بھی اپنی تقریروں میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بات کرتے نظر آتے ہیں۔

اسی طرح عمل جراحی کو دیکھ لیجیے۔ اب یہ بالکل ممکن ہے کہ برف کے اندر رکھ کر ایک انسان کو فریز کر دیا جائے، اور منجمد حالت میں اس کے ٹکڑے کر دیے جائیں اور پھر اس کو سی لیا جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مزید یہ کہ جینیٹک انجینئرنگ میں نت نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ گندم کے بیج کے اندر ایسی تبدیلی کی گئی ہے کہ گندم کی زیادہ پیداوار ہو رہی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ جائیں گے اور پوری دنیا کے اندر امن قائم ہو جائے گا تو اتنے بڑے بڑے انار ہوں گے کہ اس کے ایک چھلکے کے سائے میں پوری فوج آرام کرے گی۔ تو اس کی طرف پیش قدمی تو شروع ہو چکی ہے۔ امریکہ کے شہر کیلیفورنیا میں بہت لمبی لمبی کھجوریں ہیں، اگرچہ ان کا وہ ذائقہ نہیں ہے جو سعودی عرب کی کھجوروں کا ہے۔

دنیا کی معیشت پنجۂ یہود میں

ایک اور بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ یہ دنیا اب ''یک قطبی دنیا'' (Unipolar World) بن چکی ہے اور اس کا کنٹرول ایک ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ پوری معیشت کے اوپر یہودیوں کا مکمل کنٹرول ہے۔ آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، ڈبلیو ٹی او (World Trade Organization) اور ٹرپس (TRIPS) کے معاہدے کے ذریعے پوری معیشت پر یہودیوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ ٹرپس کا معاہدہ یہ ہے کہ کوئی ملک اپنا بیج پیدا نہیں کرے گا، بلکہ اُن سے خریدے گا، ورنہ معاشی پابندیاں (sanctions) لگ جائیں گی۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے اگر تم دو سو من گندم حاصل کرتے تھے تو جو بیج آج تمہارے پاس ہے اس سے اب تین سو من گندم حاصل کر رہے ہو۔ یہ چونکہ ہم نے پیدا کیا ہے، ہماری جینیٹک انجینئرنگ سے یہ بیج پیدا ہوا ہے تو ہمیں اس کی رائیلٹی ملنی چاہیے، لہٰذا بیج تم ہم سے خریدو گے، اور ہم بیج بھی ایسا دیں گے کہ تمہیں اس سے بس ایک ہی فصل مل سکے گی جس سے آگے بیج حاصل نہیں ہو سکے گا۔ جیسے آج کل فارمی مرغی ہوتی ہے، اُس کے انڈے سے

مرغی کا بچہ تو نہیں پیدا ہو سکتا۔ اب ایران کو سب سے بڑی دھمکی یہی دی جا رہی ہے کہ معاشی پابندیاں لگ جائیں گی۔ ایران پھر بھی اپنی ہمت سے یہ پابندیاں جھیل جائے گا‘ لیکن سوچیے کہ پاکستان پر اگر یہ پابندیاں لگ جائیں تو کیا پاکستان کے لوگوں میں اتنی ہمت ہے کہ کھڑے رہ جائیں؟ (اس حوالے سے مجھے صدر مشرف سے شدید اختلاف ہے ‘انہیں طالبان کے معاملے میں یوٹرن نہیں لینا چاہیے تھا‘ بلکہ اللہ پر اعتماد کرنا چاہیے تھا)۔ ایران کے پاس تو چلئے تیل ہے۔ لیکن پابندیوں کے ساتھ پاکستان کا معاملہ کیسے چلے گا؟ کپڑے کی ایکسپورٹ اگر بند کر دی جائے تو ساری ملیں بند ہو جائیں گی‘ لاکھوں ملازمین بے روزگار ہو جائیں گے‘ گارمنٹس کی فیکٹریاں اور ٹیکسٹائل ملز بند ہو جائیں گی۔

آج دنیا کی معیشت کی یہ حالت ہے کہ وہ یہود کی مٹھی میں ہے۔ وہ اگر امریکہ کے سٹاک ایکسچینج میں اتار چڑھاؤ پیدا کر دیں تو ذرا سی دیر میں امریکہ پھنس کر رہ جائے گا‘ اس کی ساری معیشت تباہ ہو جائے گی‘ سٹاک مارکیٹ میں ایک قیامت آ جائے گی‘ امریکہ کے تخت الٹ جائیں گے۔ اور یہ ہو کر رہنا ہے۔ جیسے ہی امریکہ نے کسی معاملے میں اسرائیل کی رضامندی کے خلاف کوئی عمل شروع کیا اسرائیل اِس کو ختم کر دے گا۔ ہمارے ہفت روزہ ’’ندائے خلافت‘‘ کے ایک شمارے میں عابد اللہ جان نے اپنے انگریزی مقالے میں لکھا ہے کہ:

"In very near future Israel will be the supreme power on the earth."

یعنی مستقبل قریب میں دنیا کی سپریم پاور امریکہ نہیں ہوگا‘ بلکہ اسرائیل ہوگا—— اور یہ پورے مشرقِ وسطیٰ پر پھیلا ہوا ہوگا۔ مصر کا بہترین علاقہ اُس کے پاس ہوگا۔ جزیرہ نمائے سینا اُس کے پاس ہوگا۔ اس نے فلسطین کو واقعتاً باغ و بہار بنا دیا ہے اور وہ صحرا سونا اُگل رہا ہے۔ اس کے علاوہ پورا عراق‘ پورا شام‘ لبنان‘ اردن اور ترکی کا جنوبی حصّہ اُس کے پاس ہوگا۔ نیز حجاز کا بھی شمالی حصّہ یعنی خیبر وغیرہ اُس کے پاس ہوگا۔ البتہ مدینہ منورہ کو اللہ تعالیٰ بچا لے گا۔ وہاں فرشتے کھڑے ہوں گے اور اس کا دفاع کریں گے‘ ورنہ ان کے نزدیک عظیم تر اسرائیل کا جو منصوبہ ہے مدینہ منورہ اس میں شامل ہے۔ مدینہ منورہ میں

یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے وہاں سے نکالا تھا۔ اگر یہ ’’سپریم پاور‘‘ وجود میں آتی ہے تو دجّال یہیں سے کھڑا ہوگا جو خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ اِس وقت ساری معیشت اُدھر جا رہی ہے۔ ’’ٹرپس‘‘ کا معاملہ آ چکا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے ذریعے سے ٹریڈ کنٹرول ہو رہی ہے۔ باہر کا مال سستا آ رہا ہے۔ وہ بہت بڑے پیمانے پر مال بناتے ہیں جس میں خرچ کم آتا ہے۔ آپ اس پر ٹیکس بھی نہیں لگا سکتے۔ اس طرح آپ کا اپنا مال ختم ہو جائے گا اور آپ کی اپنی صنعتیں تباہ ہو جائیں گی۔

یک چشمی دجالیت

یہ دجّالی فتنہ تو آ چکا ہے‘ لیکن صرف یہی فتنہ نہیں ہوگا‘ بلکہ احادیث نبویہؐ کے مطابق دجّال ایک انسان ہی ہوگا جو اپنے لیے سجدہ کروائے گا۔ اُس کی ایک آنکھ ہوگی۔ وہ کہے گا مجھے مانو میں تمہارا ربّ ہوں! ذرا یہ بات سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جیسے یہ دو آنکھیں دی ہیں اسی طرح نوعِ انسانی کو علم کے حصول کے لیے بھی دو آنکھیں دی ہیں۔ ایک آنکھ سے ہم دنیا کا علم حاصل کرتے ہیں‘ یعنی مادّی علم۔ آنکھوں سے دیکھا‘ کانوں سے سنا اور نتیجہ نکالا تو ایک بات معلوم ہو گئی۔ پھر مزید سوچا‘ مزید غور کیا‘ مشاہدہ کیا اور ہوتے ہوتے قدم بقدم علم بڑھتا گیا۔ جیسے ارشادِ الٰہی ہے: ﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرۃ:۳۱) کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھا دیے تھے۔ اور صرف نام نہیں‘ بلکہ دنیا کی ہر چیز کا علم دے دیا تھا۔ یہ وہ شے ہے جو بِالقُوّۃ (potentially) آدمؑ کو دے دی گئی تھی۔ جیسے آم کی گٹھلی میں پورا آم کا درخت ہوتا ہے ایسے ہی بِالقُوّۃ وہ علم حضرت آدم علیہ السلام کو دے دیا گیا۔ لیکن جس طرح آم کی گٹھلی سے آم کے درخت کو بننے میں کئی سال لگتے ہیں اسی طرح اس علم کے پھیلاؤ میں اور اس کے واضح اور نمایاں ہونے میں ہزاروں سال لگے ہیں۔ یہ ’’علم بالحواس‘‘ یعنی علم بالعقل ہے۔ حواسِ خمسہ سے آپ نے معلومات حاصل کیں‘ عقل نے انہیں پراسیس کیا اور نتیجہ نکالا۔ میں سادہ سی مثالیں دیا کرتا ہوں کہ یہ ٹیکنالوجی جو آج آسمان سے باتیں کر رہی ہے‘ اس کے بارے میں ذرا سوچیے کہ انسان نے سب سے پہلے کیا ذریعۂ توانائی (source of energy)

دریافت کیا تھا! ہمارے کسی جدّ امجد نے دیکھا کہ ایک چٹان اوپر سے گری اور نیچے پتھر سے ٹکرائی تو آگ کا شعلہ نکلا۔ اب اس نے اس پر تجربہ کیا کہ ایک پتھر لے کر اسے دوسرے پر رگڑا تو آگ نکل آئی۔ اس طرح سے آگ ایجاد ہوگئی۔ یہ اوّلین ذریعہ توانائی ہے۔ اس سے پہلے یا تو وہ پھول اور پتے کھاتا تھا' پھل کھاتا تھا' درختوں کی جڑیں کھاتا تھا' یا پھر جانوروں کا شکار کر کے کچا گوشت کھاتا تھا' جیسے شیر اور بھیڑیے وغیرہ کھاتے ہیں۔ آگ کی ایجاد کے بہت عرصہ بعد ایک انسان نے مشاہدہ کیا کہ آگ کے اوپر رکھی ہوئی دیگچی کا ڈھکنا ہل رہا ہے۔ اُس نے سوچا یہ کون سی طاقت ہے جو اِس ڈھکنے کو ہلا رہی ہے۔ کیا کوئی جن یا بھوت ڈھکنے کو ہلا رہا ہے؟ پتا چلا یہ بھاپ ہے جس میں طاقت ہے' لہٰذا اسے استعمال کیا گیا۔ اس طرح سے سٹیم انجن بن گئے۔ چنانچہ یہ علم ترقی کرتا کرتا یہاں تک پہنچا کہ الیکٹرک چیزیں ایجاد ہوگئیں اور پھر ہائیڈروجن بم ایجاد ہوگیا۔ یہ سب کیا ہے؟ رفتہ رفتہ اور قدم بقدم انسان کا علم بڑھ رہا ہے۔ یہ علم کی ایک آنکھ ہے جو انسان کو دی گئی ہے۔

دوسری آنکھ شریعت ہے کہ یہ کرو' یہ نہ کرو! آدم علیہ السلام کو خلافت ارضی عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی...﴾ (البقرۃ:۳۸) ''پھر جب تمہارے پاس میری طرف سے آئے کوئی ہدایت.....'' اس کی مثال مَیں یہ دیا کرتا ہوں کہ آپ جب مری جاتے ہیں تو جگہ جگہ لکھا ہوا دیکھتے ہیں سپیڈ کم کریں! اس طرح آپ کی آزادی کے اوپر تو قدغن لگ گئی۔ آپ ستّر (۷۰) کی سپیڈ میں جانا چاہتے ہیں لیکن کہا جاتا ہے سپیڈ کم کریں۔ اور اگر آپ کم نہیں کریں گے تو سیدھے کھائی میں جائیں گے۔ شریعت اسی چیز کا نام ہے کہ یہ کرو' یہ تمہارے حق میں بہتر ہے! اور یہ نہ کرو' یہ بری شے ہے' تمہارے حق میں اس کا نتیجہ خراب نکلے گا جو کہ تم نہیں جانتے۔ شریعت مکمل ضابطۂ حیات ہے کہ یہ فرض ہے' یہ واجب ہے' یہ ضرور کرو! اور یہ مکروہ ہے' یہ حرام ہے' اس سے لازماً بچو! یہ ساری چیزیں آسمانی ہدایت یعنی ''وحی'' کے ذریعے سے آئیں۔

تو یہ دو آنکھیں تھیں۔ اب ایک آنکھ مکمل طور پر بند کر لی گئی کہ وحی کی طرف دیکھنا

ہی نہیں۔ عالمی تہذیب صرف سائنسی علم کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ امریکہ کی طاقت کی بنیاد اُس کی ٹیکنالوجی ہے۔ چنانچہ روس کو افغانستان میں امریکہ نے شکست دی۔ اگرچہ افغانوں نے جانیں دیں' لیکن انہیں سٹنگر میزائل تو امریکہ نے دیے تھے۔ اگر سٹنگر میزائل نہ ہوتے تو روسی فوجی کبھی بھی افغانستان سے واپس نہ جاتے۔ روسیوں کا سب سے بڑا ہتھیار گن شپ ہیلی کاپٹر تھے' جنہیں افغان مجاہدین نے سٹنگر میزائلوں سے نشانہ بنایا۔ پہاڑوں میں میدانی جنگ تو ہو نہیں سکتی' ورنہ افغانوں سے اس معاملے میں کوئی آگے نہیں نکل سکتا۔ اُن سے تو امریکہ نے بھی میدانی جنگ نہیں کی' بلکہ ڈیزی کٹر آسمان سے پھینکے ہیں جن سے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ تو امریکہ ٹیکنالوجی کے بل پر سپریم پاور ہے۔ ورنہ روبرو لڑائی کی تو اُس میں کوئی طاقت ہے ہی نہیں۔ رمز فیلڈ کے الفاظ میں نے ٹیلی ویژن پر خود سنے تھے کہ افغان ''Resilient Fighter'' یعنی چمٹ جانے والے جنگجو ہیں' پیچھا چھوڑتے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے کہ جس کے سامنے موت ہی سب سے بڑی کامیابی ہو اُس کو کون مارے گا! بقول شاعر ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیے!

جبکہ امریکی لڑتے ہیں جان بچاتے ہوئے' تو کیسے مقابلہ کریں گے!

دجّال کی شخصیت

ایک صحیح حدیث میں حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کسی بحری سفر پر تھے تو سمندر میں طوفان آیا' سمندر کی موجیں اُن کے ساتھ کھیلتی رہیں اور اُن کی کشتی کسی سنسان جزیرے میں جا کر ٹک گئی۔ اس میں وہ داخل ہوئے تو انہیں وہاں ایک عجیب سی مخلوق نظر آئی۔ اس کے پورے جسم پر اتنے بال تھے کہ نہ مُنہ کا پتا چلتا تھا کدھر ہے اور نہ دُم کا۔ اس مخلوق سے انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو تو اُس نے کہا ''مَیں جساسہ (جاسوس عورت) ہوں''۔ پھر اُس نے کہا کہ فلاں جگہ پر جاؤ' وہاں ایک گرجا ہے جہاں ایک شخص تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ یہ وہاں پہنچے تو ایک بہت اونچا اور لمبا چوڑا پہلوان تھا' جو لوہے کی زنجیروں

کے اندر جکڑا ہوا تھا۔ اس نے اُن سے کہا میں دجّال ہوں‘ ابھی مَیں قید ہوں‘ ایک وقت آئے گا کہ مجھے آزادی مل جائے گی تو میں دنیا میں آؤں گا۔ حضرت تمیم داریؓ نے جب یہ واقعہ سنایا تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو جمع کیا کہ آؤ سنو! میں تمہیں دجّال سے خبردار کرتا رہا ہوں‘ آج تمیم داریؓ یہ خبر لے کر آئے ہیں۔

تو اِن احادیث کی بنا پر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ کہ دجّال ایک شخص ہوگا اور وہ اسرائیل کا حکمران ہوگا۔ لیکن جیسے کہ میں نے عرض کیا‘ اس کے لیے فضا ہموار ہو چکی ہے اور دجّالیت پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ مادّے کے عناصر اور فطرت کی قوتوں کے اوپر قابو پایا جا چکا ہے۔ اسے اقبال نے کہا ہے: ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

ہم کبھی بچپن میں پڑھا کرتے تھے ’’چندا ماموں دُور کے‘‘۔ لیکن اس چندا ماموں کو اب انسان اپنے قدموں سے رگڑ کر اور اس پر چہل قدمی کر کے آ چکا ہے۔ دیکھئے خلا کے اندر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ خلا کے اندر ہی خلائی سٹیشنوں کے عملے کی تبدیلی ہوتی ہے۔ پچھلا عملہ واپس آتا ہے تو نیا عملہ جا کر چارج سنبھال لیتا ہے۔ یہ ہے دجّالی فتنہ!

میری آج کی گفتگو کا عنوان ذہن میں پھر تازہ کر لیں: ’’تیس دجّال‘ دجّالی فتنہ اور دجّالِ اکبر‘‘۔ یہ تیس دجّال وہ ہیں جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کریں گے۔ اِن میں سے دو تو ہمارے زمانے میں آئے ہیں اور وہ اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ کم بخت دونوں کے دونوں زندہ ہیں۔ زندہ اس معنی میں کہ ان کی جماعتیں زندہ اور متحرک ہیں۔ اس سے پہلے جتنے دجّال اٹھے تھے وہ ختم ہو گئے‘ معدوم ہو گئے۔ کچھ عرصہ انہوں نے بہار دکھائی‘ اس کے بعد کوئی ان کا نام لیوا نہیں رہا۔ جبکہ ایران کے بہاء اللہ نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تو پاکستان میں اس کے پیروکار بہائی موجود ہیں اور بہت فعال ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ اسلام آباد میں ان کا بہت بڑا دفتر ہے۔ اسی طرح قادیانی ہیں۔ پورا مغرب اِن کی مدد کر رہا ہے جیسے انہوں نے ہندوستان کے اندر انگریزوں کی مدد کی تھی۔ اگر کوئی باہر جا کر کہہ دے کہ میں قادیانی

ہوں اور مجھے پاکستان میں جان کا خطرہ ہے تو اسے وہاں کی شہریت مل جائے گی۔

بہرحال ’’ثلاثُون دجّالون کذّابون‘‘ کے حوالے سے تیس دجّال تو وہ ہوں گے جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کریں گے‘ جبکہ ایک دجّال وہ ہوگا جو خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اس کے آثار دنیا میں سامنے آ چکے ہیں۔ اس کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ سارے کے سارے ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ البتہ کوئی شخصِ معیّن بھی ہوگا جسے حدیث میں ’’المسیحُ الدَّجّال‘‘ کا نام دیا گیا ہے۔ وہ ایک یہودی ہوگا جو ’’مسیح‘‘ ہونے کا دعویٰ کرے گا جسے حضرت مسیح علیہ السلام قتل کریں گے۔ مَیں ان موضوعات پر تقریریں کر چکا ہوں کہ مشرقِ وسطیٰ کے اندر ’’المَلحَمۃُ العُظمٰی‘‘ (بہت بڑی خونریز جنگ) ہوگی اور اس کے نتیجے میں ایک دفعہ ’’عظیم تر اسرائیل‘‘ قائم ہو جائے گا۔ تمام عرب ممالک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں گے۔ اس کے بعد پھر عرب میں حضرت مہدی کا ظہور ہوگا‘ جو ایک خالص اسلامی حکومت قائم کریں گے‘ جیسے رسول اللہ ﷺ نے عرب کے اندر اسلامی حکومت قائم کر دی تھی۔ لیکن مہدی کی حکومت کو چلانے کے لیے ایک مشرقی ملک کی طرف سے اُن کی مدد کے لیے فوجیں جائیں گی‘ اور وہ اِن شاء اللہ ہم ہوں گے‘ یعنی پاکستان اور افغانستان‘ اور یہاں پہلے سے اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہوگی۔ از روئے حدیثِ نبویؐ: ((یَخْرُجُ نَاسٌ مِنَ الْمَشْرِقِ فَیُوَطِّئُوْنَ لِلْمَھْدِیِّ یَعْنِیْ سُلْطَانَہٗ)) (رواہ ابن ماجہ) یعنی ایک مشرقی ملک سے فوجیں آئیں گی جو مہدی کی حکومت کو جمائیں گی۔ اس کے بعد مہدی نے اس گریٹر اسرائیل کے خلاف جنگوں کا سلسلہ شروع کرنا ہے۔ اس میں انہیں کافی کچھ فتوحات حاصل ہو جائیں گی۔

اِس وقت تک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری عیسائی دنیا مسلمانوں کے خلاف مقابلے میں آئے گی‘ مگر یہودی نہیں آئیں گے‘ جس کی مثال آپ خلیج کی جنگ میں دیکھ چکے ہیں۔ اسرائیل نے چاہا کہ وہ بھی میدان میں آ جائے لیکن امریکہ نے کہا کہ نہیں‘ تم اگر میدان میں آئے تو تمام عالَمِ عرب میں ہمارے خلاف ایک ردِّعمل پیدا ہوگا‘ بس ہم تمہاری حفاظت کر رہے ہیں۔ دیکھئے امریکہ نے افغان مجاہدین کو تو سٹنگر میزائل دیا تھا مگر اسرائیل

کو پیٹریاٹ میزائل دیا ہے‘ جو آگے بڑھ کر حملہ آور میزائل سے ٹکرا کر اسے راستے ہی میں تباہ کر دیتا ہے۔ عراق میں یہی ہوا ہے۔ صدام حسین کو اپنے سکڈ میزائل پر بڑا غرہ تھا کہ یہ اسرائیل کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا‘ لیکن پیٹریاٹ آ گیا تو وہ ختم ہو گیا۔ تو امریکہ نے اسرائیل کو جنگ میں نہیں آنے دیا تھا۔ اب بھی عراق کے خلاف جو کمیشن بنا ہے اس میں اسرائیل کو شامل نہیں کیا گیا۔ آرمیگاڈان (المَلحمۃُ العُظمٰی) کے اندر بھی ایسا ہی ہو گا کہ عیسائی یہودیوں کو حکومت بنا کر دیں گے۔ لیکن اس کے بعد پانسہ پلٹے گا۔ اگرچہ ابھی ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ پانسہ کیسے پلٹے گا‘ لیکن پلٹے گا ضرور۔ اس لیے کہ یہ فرمایا ہے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے‘ جو الصادق والمصدوق ہیں اور اُن کی سچائی پر اللہ گواہ ہے۔

بہرحال پھر پانسہ پلٹے گا اور مسلمان ایک ایک کر کے اپنے ملک واپس لے لیں گے۔ پھر تنگ آ کر اسرائیل میں سے ایک دجّال اٹھے گا جو دعویٰ کرے گا کہ میں مسیح ہوں۔ وہ مسیح الدجّال ہو گا۔ جب وہ سامنے آئے گا تو آسمان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اٹھا لیا تھا۔ وہ دجّال کو قتل کریں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جہاں تک اُن کی نگاہ جائے گی یہودی پگھلتے چلے جائیں گے۔ آج لیزر سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ اُن کی آنکھوں میں اللہ تعالیٰ بہت زوردار لیزر پیدا کر دے گا کہ جہاں تک ان کی نگاہ جائے گی سب کے سب یہودی تہس نہس ہو جائیں گے اور اس کے بعد ایک مذہب کی حیثیت سے پوری دنیا کے اندر عیسائیت ختم ہو جائے گی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کہیں گے کہ مجھے تم نے سولی چڑھایا ہی نہیں‘ بس خواہ مخواہ یہ صلیبی معاملہ بنا لیا۔ اور مَیں تو کہہ گیا تھا کہ تورات کی شریعت تم پر لاگو رہے گی لیکن تم نے اسے ختم کر دیا۔ تورات کی رو سے سود حرام ہے‘ لیکن تم نے سود کھایا۔ اسی طرح کا معاملہ خنزیر کا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کر دیں گے۔ بہرحال عیسائیت ختم ہو جائے گی اور عیسائی مسلمانوں میں مدغم ہو جائیں گے اور اسلام دنیا میں سب سے بڑی طاقت بن جائے گا۔ یہ وقت آ کر رہے گا۔ میرا گمان ہے کہ پھر اس کے بعد اصل میں وہ خدائی کا دعویٰ کرنے والا ’’دجّال‘‘ آئے گا۔ میرا گمانِ غالب ہے کہ

وہ خود ابلیس (عزازیل) ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ابلیس کا کوئی بہت بڑا سپہ سالار ہو جسے ابھی اللہ نے کسی جزیرے کے اندر قید کر رکھا ہے‘ اور ایک وقت میں آ کر اسے کھول دیا جائے گا‘ پھر وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا۔

قیامت کی آمد بدترین لوگوں پر

آخر میں ایک حدیث ملاحظہ کیجیے‘ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کی آمد بدترین لوگوں پر ہو گی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ’’دجال میری اُمّت میں ظاہر ہو گا‘ پھر چالیس تک ٹھہرے گا (مجھے علم نہیں کہ چالیس دن‘ چالیس مہینے یا چالیس سال) اس کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کو بھیجیں گے‘ وہ ہو بہو عروہ بن الزبیر کے ہم شکل ہوں گے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ اسے تلاش کر کے مار دیں گے۔ پھر لوگ اس حال میں سات سال گزار دیں گے کہ کوئی دو آدمیوں کے درمیان بھی مخالفت یا دشمنی نہ ہو گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چلائیں گے تو روئے زمین پر ذرّہ برابر نیکی یا ایمان کا مالک آدمی زندہ نہ بچ سکے گا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی پہاڑ کی کھوہ میں بھی پہنچ جائے تو یہ ہوا وہاں پہنچ کر بھی اسے ختم کر دے گی‘‘۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مزید یوں ارشاد فرمایا: ’’آخر کار صرف درندوں کی مانند شہوت پرست اور فساد کے دلدادہ برے لوگ ہی بچیں گے‘ جو نہ کسی اچھائی کو اچھائی سمجھیں گے اور نہ کسی برائی کو برائی۔ اسی موقع پر شیطان بھی اُن کے سامنے انسانی شکل میں آئے گا اور ان سے کہے گا: کیا تم میری بات نہیں مان لیتے؟ وہ پوچھیں گے: تمہارا کیا حکم ہے؟ تو شیطان انہیں غیر اللہ کی عبادت کا حکم دے گا‘ حالانکہ اُن کا رزق بھی وافر ہو گا اور زندگی بھی پُرآسائش ہو گی۔ اس کے بعد صور میں پھونک دیا جائے گا۔ چنانچہ جس کے کان میں بھی آواز پہنچے گی وہ دائیں یا بائیں گردن جھکا کر بہت توجّہ سے سننے لگ جائے گا۔ اور سب سے پہلے وہ آدمی سنے گا جو اپنے اونٹوں کے حوض کی مرمت کر رہا ہو گا۔ چنانچہ وہ بے ہوش ہو جائے گا اور دوسرے لوگ بھی بے ہوش ہو جائیں گے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ دھند یا شبنم کی شکل میں پانی نازل کریں گے‘ جس کی بدولت لوگوں کے جسم (قبروں سے)

اُگ آئیں گے۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو یکا یک کھڑے ہو کر حیران و پریشان اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں گے۔ پھر آوازہ بلند ہوگا: لوگو! اپنے رب کے حضور پیش ہو جاؤ اور وہیں کھڑے رہو‘ تمہارا حساب کتاب ہونے والا ہے۔ اب حکم ہوگا کہ دوزخ میں جانے والوں کو علیحدہ کر دو۔ فرشتے سوال کریں گے: کتنے لوگوں کو؟ جواب ملے گا: ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے کو جہنم کے لیے علیحدہ کر دو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہی دن ہے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور اسی دن اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کا دیدار کروائیں گے۔‘‘(۹)

واہ کینٹ میں ہمارے ایک دوست قاضی ظفر الحق صاحب ہیں جو کتب احادیث میں کتاب الملاحم (جنگوں کا باب) اور کتاب اشراط الساعۃ (علاماتِ قیامت کا باب) وغیرہ کے حوالے سے تحقیق کرتے رہے ہیں جن میں حضرت مہدی‘ دجّال اور نزولِ مسیحؑ کا ذکر ہے۔ احادیث میں یہ بھی ملتا ہے کہ ایک یہودی لڑکا تھا ابنِ صیاد۔ رسول اللہ ﷺ نے گمان کیا شاید یہی دجّال ہے۔ وہ سوتے ہوئے بھی دیکھتا تھا‘ پیٹھ کے پیچھے سے بھی دیکھتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں اسے قتل کر دوں؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں‘ اگر یہ دجّال ہے تو اسے حضرت مسیحؑ نے قتل کرنا ہے‘ اور اگر نہیں ہے تو تم خواہ مخواہ ایک قتلِ ناحق کے مرتکب ہو جاؤ گے۔ بہرحال مَیں اُس شخص دجّال کے بارے میں آپ سے کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ ظاہر بات ہے میں ریسرچ سکالر نہیں ہوں‘ میں تو ایک داعی ہوں‘ مبلغ ہوں۔ تحقیق کے لیے احادیث کی بہت زیادہ کتابوں کو چھاننا پڑتا ہے اور حدیث کا ذخیرہ بہت وسیع ہے۔ میں تو اِس قرآن کا طالب علم ہوں جو معیّن ہے‘ اس سے باہر قرآن نہیں اور اس کے اندر قرآن کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ جبکہ حدیث کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اسماء الرجال میں حدیث کے ہر راوی کی جرح و تعدیل یعنی چھان بین ہوتی ہے کہ وہ قابلِ اعتماد ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ کچھ کتابوں میں ضعیف اور موضوع احادیث کو بھی جمع کر لیا گیا ہے تاکہ لوگ ان سے آگاہ ہو جائیں۔

بہرحال میں حدیث کا تو طالب علم نہیں ہوں‘ جبکہ قرآن کا طالب علم ہوں۔ اس لیے

میں نے اپنے خطاب میں پہلے قرآن کے حوالے سے دجّال اور فتنۂ دجال کی بات کی ہے کہ یہ دنیا دجّال ہے‘ دولت دجّال ہے‘ دنیا جتنی حسین ہوگی اتنی ہی بڑی دجّال ہو جائے گی۔ آج ساری ٹیکنالوجی دنیا کو حسین سے حسین تر بنانے میں لگی ہوئی ہے۔ نیویارک کے اندر جو Twin Towers تھے انہیں دیکھ کر انسان مبہوت ہو جاتا تھا کہ یہ عمارت انسان نے بنائی ہے یا حضرت سلیمان علیہ السلام کے جِنّوں نے! اسی طرح شکاگو میں بڑے بڑے ٹاورز ہیں۔ ٹورنٹو میں دنیا کا سب سے اونچا ٹاور ہے۔ تو انسان نے کیا کچھ بنا ڈالا ہے۔ کتنے بڑے بڑے پُل بنائے ہیں! سمندروں میں پُل بنا دیے ہیں۔ دنیا کے اندر بہت زیادہ مادّی ترقی ہو رہی ہے۔ یورپ میں زندگی کی بے انتہا آسائشیں اور لذتیں موجود ہیں۔ یہ دنیا جتنی حسین ہوگی انسان اس پر اتنا ہی زیادہ فریفتہ ہوگا‘ اور جو اس پر فریفتہ ہو گیا وہ اللہ کی طرف سے غافل ہو گیا۔ اس کے بارے میں بعض صوفیاء نے بہترین بات کہی ہے کہ یہ دنیا دریا یا سمندر ہے اور تمہارا دل کشتی ہے۔ تم سمندر میں چلو ضرور‘ لیکن سمندر کا پانی کشتی کے اندر نہ آنے دو‘ کشتی میں پانی آ گیا تو یہ ڈوب جائے گی۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَالِیْ وَمَا لِلدُّنْیَا‘ مَا اَنَا فِی الدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا))(۱۰)

’’مجھے دُنیا سے کیا سروکار! میری مثال تو ایک مسافر کی سی ہے جو تھوڑی دیر کے لیے کسی درخت کے نیچے بیٹھتا ہے‘ سستاتا ہے اور پھر اسے چھوڑ کر (اپنی منزل کی طرف) چل دیتا ہے۔‘‘

یعنی وہ شجر سایہ دار اُس کا گھر تو نہیں ہے۔ اسی طرح یہ دنیا ہمارا گھر نہیں ہے۔ یہ دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے۔ اس دنیا میں جو محبتیں ہیں وہ خطرہ ہیں۔ جیسے سورۃ التغابن میں فرمایا گیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۴)

’’اے ایمان کے دعوے دارو! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں‘ لہٰذا اِن سے بچو۔‘‘

دشمن اس حوالے سے ہیں کہ ان کی محبّت میں تم حرام خوری کرتے ہو‘ انہیں اچھے سے اچھا کھلانے کے لیے رشوتیں لیتے ہو‘ غبن کرتے ہو۔ ان کے لیے یہ سب کچھ کر کے تم گویا اللہ کی ناراضی مول لے رہے ہو تو وہ تمہارے دشمن ہوئے ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’سب سے احمق شخص وہ ہے جو دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت برباد کر دے۔‘‘ تم اولاد کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت برباد کر رہے ہو تو وہ تو تمہارے دشمن ہوئے۔

قرآن کی رُو سے دجّال اور دجّالیت یہ دنیا ہے۔ البتہ ایک دجّال وہ ہے جس کا حدیث کے اندر ذکر ہے۔ اس کے لیے مَیں مثال دے چکا ہوں کہ ایک سود وہ ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے‘ جسے ’’رِبا النَّسیئۃ‘‘ کہتے ہیں‘ اور ایک سود وہ ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے جسے ’’ربا الفَضل‘‘ یا ’’ربا الحدیث‘‘ کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک دجّالیت وہ ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے‘ اس کا علاج سورۃ الکہف ہے جس کا تجزیہ میں نے آپ کے سامنے کر دیا ہے۔ اسے پڑھیں اور سمجھیں۔

بہرحال اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس دنیا کی دجّالیت سے اپنے آپ کو آزاد کریں ۔ دجّال اب تیزی کے ساتھ عورتوں کے فتنے کی شکل میں آگے بڑھ رہا ہے۔ پاکستان میں چالیس ہزار عورتوں کو صدر پرویز مشرف نے ایک جنبشِ قلم کے ذریعے میدان میں لا کر کھڑا کر دیا۔ دجّال کا ایک کارنامہ یہی ہے کہ عورتوں کو گھروں سے نکالا جائے اور یہ اعتماد کے ساتھ اسمبلیوں میں‘ دفاتر میں اور بازاروں میں آئیں۔ اگر وہ سیکس ورکر ہیں تب بھی انہیں برا نہ سمجھا جائے۔ دوسرے یہ کہ خاندان کا ادارہ تباہ ہو جائے۔ جنسی خواہشات کی تکمیل میں ہر طرح کی آزادی ہو۔ مغربی تہذیب میں زنا ہرگز کوئی بری بات نہیں‘ ہاں زنا بالجبر بری بات ہے۔ باہمی رضامندی سے ایک عورت اور مَرد زنا کریں تو کوئی جرم نہیں ہے‘ البتہ زنا بالجبر یا کم عمر کے ساتھ ملوث ہونا جرم ہے۔ یعنی ایک خاص عمر سے چھوٹی بچی یا ایک خاص عمر سے چھوٹا لڑکا ہے تو اُن کے ساتھ کوئی جنسی حرکت کرنا جرم ہو جائے گا‘ ورنہ ہم جنس پرستی ہو یا زنا ہو‘ ان کے نزدیک جائز ہے۔

یہ ہے اِس دَور کا فتنہ‘ یعنی فتنۂ دجّال۔ اور اِس وقت اس کے اندر تیزی کے ساتھ

اضافہ ہوتا جا رہا ہے‘ اور شاید اب بہت زیادہ دیر نہ لگے کہ وہ اصل دجّالِ اکبر رونما ہو جائے۔ میرے اب تک کے مطالعے کا حاصل یہ ہے کہ ایک دجّال وہ ہوگا جسے مسیح دجّال کہا گیا ہے۔ وہ دجّال ’’مسیح‘‘ ہونے کا‘ نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا اور وہ ’’ثَلاثون دجّالون کذّابون‘‘ میں سے ایک ہوگا۔ اس دجال کو قتل کرنے کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کی حکومت چالیس برس تک اس دنیا میں رہے گی۔ دوسرا دجّال وہ ہوگا جو خدائی کا دعویٰ کرے گا اور میرے خیال میں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چالیس سالہ دَورِ حکومت کے اواخر میں سامنے آئے گا اور اس کے بعد اہلِ ایمان سخت ترین آزمائش سے دوچار ہوں گے۔ واللہ اعلم!!

حواشی

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب المناقب‘ باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الفتن واشراط الساعۃ‘ باب لا تقوم الساعۃ حتی یمر الرجل بقبر الرجل فیتمنی۔

(۲) صحیح البخاری‘ کتاب الفتن‘ باب ذکر الدجّال۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الفتن واشراط الساعۃ‘ باب ذکر الدجّال وصفتہ ومامعہ۔

(۳) صحیح مسلم‘ کتاب الفتن واشراط الساعۃ‘ باب فی بقیۃ من احادیث الدجّال۔

(۴) سنن ابی داؤد‘ کتاب الملاحم‘ باب فی خبر ابن صائد۔

(۵) سنن الترمذی‘ کتاب الفتن عن رسول اللہ ﷺ‘ باب ما جاء لا تقوم الساعۃ حتی یخرج کذابون۔

(۶) صحیح مسلم‘ کتاب الفتن واشراط الساعۃ‘ باب فی بقیۃ من احادیث الدجّال۔

(۷) صحیح البخاری‘ کتاب الفتن‘ باب ذکر الدجّال۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الفتن واشراط الساعۃ‘ باب ذکر الدجّال وصفتہ ومامعہ۔

(۸) صحیح مسلم‘ کتاب الفتن واشراط الساعۃ‘ باب قصۃ الجساسۃ۔

(۹) صحیح مسلم‘ کتاب الفتن واشراط الساعۃ‘ باب فی خروج الدجال... الخ‘ ح ۲۹۴۰۔ ومسند الامام احمد‘ ج ۲‘ ص ۱۶۶۔

(۱۰) سنن الترمذی‘ کتاب الزھد عن رسول اللہ ﷺ‘ باب ما جاء فی اخذ المال بحقہ۔ وسنن ابن ماجہ۔

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْحَدِیْد

آیت ۲۵

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۲۵﴾

اب آ رہی ہے وہ آیت جو اس پوری سورۂ مبارکہ کا نقطۂ عروج یا ذروۂ سنام (climax) ہے۔ اس آیت کا مضمون خصوصی طور پر آج کے مسلمانوں کے لیے بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ آج ہمارے ہاں دین کا اصل تصوّر مسخ ہو چکا ہے اور یہ آیت دین کے درست تصوّر کو اجاگر کرتی ہے۔ دراصل انگریزوں کی غلامی کے دور میں ہم مسلمانوں کے ذہنوں میں دین کا عام تصوّر یہی تھا کہ حکومت انگریز کی ہے تو ہوتی رہے‘ ہمیں کیا! ہم نے تو نمازیں پڑھنی ہیں اور روزے رکھنے ہیں۔ اس دور میں برصغیر کے ایک بہت بڑے عالم نے کہا تھا کہ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے انگریزوں کو ہماری طرف سے کوئی تشویش لاحق ہو‘ اس لیے کہ انہوں نے ہمیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ یعنی انگریز ہمیں نمازیں پڑھنے‘ روزے رکھنے‘ حج ادا کرنے اور داڑھیاں رکھنے سے نہیں روکتا۔ مذہبی آزادی کی اسی وکالت پر علّامہ اقبال نے یہ پھبتی چست کی تھی: ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

ظاہر ہے انگریز مسلمانوں کو مراسمِ عبودیت ادا کرنے اور داڑھیاں بڑھانے سے کیوں منع کرتے؟ اس سے انہیں بھلا کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ ملک میں قانون تو تاجِ برطانیہ کا نافذ تھا‘ دیوانی

اور فوجداری عدالتیں اسی قانون کے مطابق فیصلے کر رہی تھیں۔ اس ماحول میں اسلام کہاں تھا اور قرآنی قوانین کی کیا حیثیت تھی؟ عام مسلمانوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو بس اسی پر مسرور و مطمئن تھے کہ انہیں ’’مکمل‘‘ مذہبی آزادی حاصل ہے۔ بہرحال انگریز کی غلامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا تصوّرِ دین سکڑتے سکڑتے صرف چند عبادات اور رسومات (rituals) تک محدود ہو گیا۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں آج بھی تصوّرِ دین یہی ہے کہ نماز پڑھو‘ روزے رکھو‘ ہو سکے تو حج کرو‘ قرآن خوانی کی محفلیں سجاؤ اور بس! اور جہاں تک سودی کاروبار اور حرام خوریوں کا تعلق ہے یہ دُنیوی معاملات ہیں‘ اسلام کا ان سے کیا لینا دینا؟ ہاں سال بہ سال عمرہ کر کے پچھلے گناہوں سے پاک ہو جایا کرو‘ جیسے ہندو گنگا میں نہا کر اپنے زعم میں اپنے سارے پاپ دھو ڈالتے ہیں۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر جب آپ اس آیت کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو دین کا روایتی تصوّر لڑکھڑاتا ہوا محسوس ہو گا۔ اس آیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں ڈنکے کی چوٹ انقلاب کی بات کی گئی ہے‘ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسی بے باک اور عریاں انقلابی عبارت پوری انسانی تاریخ کے کسی انقلابی لٹریچر میں موجود نہیں ہے۔ اس تمہید کے بعد آیئے اب اس آیت کا مطالعہ کریں اور اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

آیت ۲۵ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ﴾ ’’ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ‘‘

﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ ’’اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری‘‘

یہاں تین چیزوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے جو رسولوں کے ساتھ بھیجی گئیں: (۱) بیّنات (۲) کتاب‘ اور (۳) میزان —— ان میں سب سے پہلی چیز ’’بیّنات‘‘ ہے۔ ’’بیِّن‘‘ اُس شے کو کہتے ہیں جو از خود ظاہر اور نمایاں ہو اور اسے کسی دلیل اور وضاحت کی حاجت نہ ہو۔ ع ’’آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!‘‘ یہ لفظ عام طور پر رسولوں کے تذکرے میں معجزات کے لیے آتا ہے۔

’’کتاب‘‘ کا لفظ عام فہم اور بالکل واضح ہے‘ جبکہ ’’میزان‘‘ سے مراد اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام ہے جس میں حقوق و فرائض کا توازن موجود ہے۔ کسی معاشرے میں اگر حقوق و فرائض کے مابین توازن ہو گا تو وہ معاشرہ صحیح رہے گا‘ اور اگر اس کے اندر عدمِ توازن راہ پا گیا تو اسی کا نام ظلم‘

عدوان‘ زیادتی اور ناانصافی ہے۔

﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ’’تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔‘‘

یہ ہے اس کتاب یعنی قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد۔ اب اس کے مقابلے میں اپنی موجودہ صورت کا بھی جائزہ لیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سے قرآن کو کس حد تک ’’بے دخل‘‘ کر چکے ہیں۔ کیا قرآن اس لیے نازل ہوا تھا کہ قرآن خوانی کی مجالس سجالی جائیں؟ یا حسنِ قراءت کی محافل کا اہتمام کرلیا جائے‘ یا اس کی آیات کی خطاطی کی نمائشیں لگائی جائیں‘ یا چالیس من وزنی قرآن سونے کی تاروں سے لکھ کر لوگوں کی زیارت کے لیے رکھ دیا جائے ـــــ اور زندگی باطل نظام کے تحت ہی بسر کی جائے؟ اس حوالے سے مولانا ماہر القادری کی زبان سے قرآن کا یہ شکوہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے: ؎

یہ میری عقیدت کے دعوے‘ قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں‘ ایسے بھی ستایا جاتا ہوں!

ظاہر ہے قرآن تو ایک ضابطہ زندگی اور ایک نظامِ حکومت لے کر آیا ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس کے نظام کو عملی طور پر اپنے ملک اور معاشرے میں قائم کریں‘ اس کی لائی ہوئی میزان کو نصب کریں اور اس کی دی ہوئی شریعت کے مطابق اپنے فیصلے کریں ع ’’گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!‘‘

اس آیت کا مطالعہ کرتے ہوئے یہاں درج ذیل آیات کو بھی دہرانے کی ضرورت ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بارے میں فرمایا: ﴿قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ (آیت ۱۸) کہ میں عدل وقسط کو قائم کرنے والا ہوں۔ سورۃ النساء میں اہلِ ایمان کو باقاعدہ حکم دیا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۱۳۵) ’’اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر‘‘۔ سورۃ المائدۃ میں الفاظ کی ترتیب بدل کر یہی حکم پھر سے دہرایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫﴾ (آیت ۸) ’’اے اہلِ ایمان! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ‘‘۔ پھر سورۃ الشوریٰ میں حضور ﷺ سے اعلان کروایا گیا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ’’مجھے حکم

ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل قائم کروں‘‘۔ پھر سورۃ الشوریٰ ہی میں فرمایا گیا: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ﴾ (آیت ۱۷) ’’اللہ وہ ہستی ہے جس نے نازل فرمائی کتاب حق کے ساتھ اور میزان بھی‘‘۔ یعنی سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں بھی کتاب اور میزان نازل کرنے کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔

اس حوالے سے سورۃ المائدۃ کی یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے: ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾ (آیت ۶۸) ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قائم نہیں کرتے تورات کو اور انجیل کو اور اُس کو جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تمہارے ربّ کی طرف سے‘‘۔ سورۃ المائدۃ کی اس آیت کے مطالعہ کے دوران میں نے کہا تھا کہ مسلمان ’’تورات وانجیل‘‘ کی جگہ لفظ ’’قرآن‘‘ رکھ کر اس آیت کو اس طرح پڑھ کر دیکھیں اور پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے خود ہی اپنی حیثیت کا تعین کریں: ’’قُلْ يٰٓاَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا الْقُرْاٰنَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ‘‘ کہ اے قرآن والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قائم نہیں کرتے قرآن کو اور اس کو جو تمہاری جانب تمہارے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے ـــــ تم قرآن کی تلاوت کر کے سمجھ لیتے ہو کہ تم نے قرآن کا حق ادا کر دیا‘ یا تراویح میں قرآن ختم کر کے فخر محسوس کرتے ہو کہ تم نے بڑا تیر مار لیا‘ چاہے تم نے اس کا ایک حرف بھی نہ سمجھا ہو۔ یاد رکھو! جب تک تم قرآن کے احکام کو عملی طور پر خود پر نافذ نہیں کرتے ہو اور قرآن کے نظامِ عدل کو اپنے ملک ومعاشرہ میں قائم نہیں کرتے ہو‘ قرآن پر ایمان کے تمہارے زبانی دعوے کی کوئی حیثیت نہیں۔

قرآن کے نظامِ عدل وقسط کے حوالے سے یہ حقیقت بھی مدِّنظر رہنی چاہیے کہ معاشرے کے مراعات یافتہ طبقات کے لیے یہ نظام کسی قیمت پر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ اس لیے جونہی اس کے قیام کے لیے ٹھوس کوششوں کا آغاز ہوگا یہ طبقات ان کوششوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے آموجود ہوں گے۔ ظاہر ہے جن سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات (vested interests) پرانے نظام کے ساتھ وابستہ ہیں‘ وہ کب چاہیں گے کہ معاشرے میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔ اگرچہ اس حوالے سے بھی تاریخ میں استثنائی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدّیق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما اپنے معاشرے کے اونچے طبقے سے تعلق

رکھتے تھے‘ اس کے باوجود ان دونوں حضراتؒ نے اپنے مفادات‘ کاروبار اور سٹیٹس کی پروا کیے بغیر حق کی آواز پر بلا تاخیر لبیک کہا۔ لیکن مجموعی طور پر اشرافیہ اور دولت مند طبقہ ہمیشہ نظامِ عدل کے قیام کی کوشش میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ مراعات یافتہ طبقات کی سرتوڑ کوشش ہوتی ہے کہ موجودہ نظام کے اندر کوئی تبدیلی نہ آئے۔ چنانچہ باطل نظام کی بیخ کنی اور نظامِ عدل وقسط کے قیام کی جِدّوجُہد کے لیے اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو راستے سے ہٹانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ آیت کے اگلے حصے میں ایسے عناصر کی سرکوبی کا نسخہ بتایا جا رہا ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ’’اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے‘ اس میں شدید جنگی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں۔‘‘

نوٹ کیجیے! نہ کوئی لگی لپٹی بات کی گئی ہے اور نہ ہی معذرت خواہانہ اسلوب اپنایا گیا ہے۔ جو بات کہنا مقصود تھی وہ دوٹوک انداز میں ڈنکے کی چوٹ کہی گئی ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ ’’عریاں ترین‘‘ انقلابی عبارت ہے۔ ظاہر ہے جب انقلاب اپنا راستہ بنائے گا اور جب ظالمانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا مرحلہ آئے گا تو خون بھی ضرور بہے گا اور کچھ سر بھی کچلنے پڑیں گے۔ یہ انقلاب کا ناگزیر مرحلہ ہے‘ اس کے بغیر انقلاب کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل کے لیے انقلاب کی بات ہو رہی ہے جو ساری کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ یہاں تو ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ دنیا میں خود انسان عدلِ انسانی کے اپنے تصوّر کی ترویج وتنفیذ کے لیے طاقت کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں‘ مخالف ممالک کا گھیراؤ کرتے ہیں‘ ان پر بے رحمانہ پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ ’’امن کے لیے جنگ‘‘ (War for Peace) کا نعرہ لگا کر کمزوروں پر چڑھائی کرتے ہیں اور پھر ملکوں کے ملک برباد کر کے رکھ دیتے ہیں‘ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس قتل و غارت اور بربریت کو وہ وقت کی اہم ضرورت اور عین انصاف سمجھتے ہیں۔

اس کائنات کا خالق اور مالک بھی اللہ ہے اور زمین پر حکمرانی کا حق بھی اُسی کا ہے۔ اُسی نے اپنی تمام مخلوق کو اپنا تابع فرمان بنایا ہے اور اُسی نے انسان کو ایک حد تک اختیار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اسی اختیار کی وجہ سے انسان اکثر من مانی کرتے ہوئے اُس کی حکمرانی کے مقابلے میں اپنی حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی وجہ سے زمین میں فساد برپا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ وہ زمین میں عدل و انصاف کی ترویج اور اپنے قانون کی حکمرانی چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس کی مشیت یہی ہے کہ اُس کے حقِ حکمرانی کو چیلنج

کرنے والے باغیوں کو حق کی طاقت کے ذریعے سے کچل دیا جائے: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ (الانبیاء:۱۸) ’’بلکہ ہم حق کو دے مارتے ہیں باطل پر تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے‘ تو جبھی وہ نابود ہو جاتا ہے‘‘۔ بہرحال اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُس کا یہ کام اُس کے نام لیوا کریں۔ اُس کے نام لیوا حق کے علمبردار بن کر اللہ کے باغیوں کا مقابلہ کریں‘ باطل نظام کو بزورِ بازو اُکھاڑ پھینکیں اور اللہ کی زمین پر اللہ کی حکمرانی کو یقینی بنائیں۔

آیت زیر مطالعہ میں لوہے کا ذکر اسی حوالے سے آیا ہے کہ اہل حق حالات و زمانہ کی ضرورت کے مطابق اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے سامانِ حرب تیار کریں‘ رائج الوقت ٹیکنالوجی سے استفادہ کریں اور باطل کے مقابلے کے لیے مطلوبہ طاقت فراہم کریں۔ لیکن اس انقلابی عمل میں سب سے اہم سوال اَفرادی قوت کی فراہمی کا ہے‘ اور اس عمل کی ابتدا دعوت وتبلیغ سے ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے مکّہ میں بارہ سال تک مسلسل دعوت وتبلیغ کا کام کیا۔ حق کو قبول کرنے والے افراد کی تربیت کی‘ انہیں منظّم کیا اور جب مطلوبہ افرادی قوت فراہم ہوگئی تو آپؐ نے اللہ کی مشیت کے عین مطابق طاقت کے اس ’’کوڑے‘‘ کو باطل کے سر پر یوں دے مارا کہ اس کا بھیجا نکال کے رکھ دیا۔ آج بھی یہ کام اگر ہوگا تو اسی طریقے سے ہوگا جس طریقے سے حضور ﷺ نے اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا۔ آج بھی اہلِ حق کو اسی طرح جانیں قربان کرنا ہوں گی‘ تکلیفیں جھیلنا پڑیں گی‘ گھر بار چھوڑنے پڑیں گے اور جان و مال کے نقصانات برداشت کرنا پڑیں گے۔ گویا یہ انتہائی مشکل کام ہے اور اہلِ حق کی بے دریغ قربانیوں کے بغیر اس کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا ممکن نہیں۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۲۵﴾

’’اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود۔ یقیناً اللہ بہت قوت والا‘ بہت زبردست ہے۔‘‘

’’تاکہ اللہ جان لے‘‘ کا مفہوم یہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ دکھا دے‘ ظاہر کر دے‘ ممیّز کر دے کہ کون ہے وہ جو غیب کے باوجود اللہ اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ گویا حق و باطل کی جنگ کے دوران جو مردانِ حق لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کے دین کے غلبے کے لیے میدان میں آئیں گے وہی اللہ اور اُس کے رسولؐ کے مددگار ہوں گے۔ دراصل اللہ کے دین کو غالب کرنا

بنیادی طور پر حضور ﷺ کا فرضِ منصبی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اسی مقصد کے لیے مبعوث فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (الصف:۹) ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ' تاکہ وہ غالب کردے اس کو کُل کے کُل دین پر''۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ حضور ﷺ کے اس مشن میں تمام اہلِ ایمان آپؐ کے دست و بازو بنیں' بلکہ سورۃ الصّف میں تو اس کے لیے براہِ راست حکم آیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۴) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ۔''

یہ مضمون سورۃ الصّف میں مزید وضاحت کے ساتھ آئے گا۔ لیکن اس حوالے سے یہاں یہ اہم نکتہ سمجھ لیجیے کہ آیت زیر مطالعہ میں غلبۂ دین کی تکمیل اور نظامِ عدل وقسط کی تنفیذ کے لیے تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے: بیّنات' کتاب اور میزان: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ یعنی حضور ﷺ سے پہلے رسولوں کو اس مشن کے لیے بینات (معجزات)' کتاب اور میزان کے ساتھ بھیجا جاتا رہا' جبکہ حضور ﷺ کو اس مشن کے لیے صرف دو چیزیں (الہدیٰ اور دین الحق) عطا کی گئیں: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ﴾ (التوبہ: ۳۳' الفتح: ۲۸ اور الصّف: ۹)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے لیے بیّنات (معجزات) اور الکتاب ایک ہو گئے۔ یعنی الہدیٰ (قرآن) آپؐ کی کتاب بھی ہے' اسی میں قانون ہے اور یہی آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ بھی ہے' جبکہ آپؐ کی رسالت میں میزان (شریعت) مکمل ہو کر ''دین الحق'' کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

آیات ۲۶ تا ۲۹

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّیْنَا بِعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ ۙ وَ جَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِیَّةَ ۟ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا

حَقَّ رِعَایَتِهَا ۚ فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۸﴾ لِّئَلَّا یَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾

اس سورۂ مبارکہ کا اصل مضمون تدریجاً آگے بڑھتا ہوا آیت ۲۵ پر اپنے نقطۂ عروج (climax) پر پہنچ گیا ہے۔ اب آئندہ آیات میں گویا اس مضمون کا ضمیمہ اور تکملہ آ رہا ہے (قبل ازیں کبھی میں بغرضِ تفہیم اس کے لیے anti climax کی اصطلاح استعمال کرتا رہا ہوں' لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ اصطلاح مناسب نہیں ہے)۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر مناسب ہوگا کہ متعلقہ آیات کے مطالعے سے پہلے اس مضمون کی روح کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔ ظاہر ہے زمین پر اللہ کے قانون کی حکمرانی اور معاشرے میں عدل و انصاف کی ترویج شیطان پر بہت بھاری ہے۔ اس لیے اس نے اس ''انقلاب'' کا راستہ روکنے کے لیے یہ چال چلی کہ مخلص اہلِ ایمان کی توجہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کی طرف مبذول کرا دی' تاکہ اُسے انسانوں کے معاشرے میں ننگا ناچ ناچنے کی کھلی چھٹی مل جائے۔

اہلِ ایمان کے دلوں میں اللہ کی محبّت' دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طلب کے جذبے کا نتیجہ تو یہ نکلنا چاہیے کہ وہ اللہ کی فوج کے سپاہی بن کر اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کے علمبردار بن جائیں اور نتائج سے بے پروا ہو کر ہر زماں' ہر مکاں شیطانی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار رہیں' لیکن شیطان نے ایسے لوگوں کو رہبانیت کا سبق پڑھا دیا کہ اللہ والوں کا دنیا کے جھمیلوں سے کیا واسطہ؟ انہیں تو چاہیے کہ وہ دنیا اور علائقِ دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں کی غاروں میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کریں اور اللہ کے ہاں اپنے درجات بلند کریں۔ ظاہر ہے ایسی رہبانیت دین کی اصل روح کے خلاف ہے۔ غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کی راہ میں مصیبتیں جھیلنے' اس میدان میں شیطانی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے مال و جان کی قربانیاں دینے اور خانقاہوں میں بیٹھ کر عبادت و ریاضت کی سختیاں برداشت کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اللہ کے راستے میں

جہاد کی سختیاں برداشت کرنے سے معاشرے سے ظلم و ناانصافی کا خاتمہ ہوتا ہے‘ انسانیت عدل و انصاف کے ثمرات سے بہرہ ور ہوتی ہے اور ماحول میں فلاح و خوشحالی کے پھول کھلتے ہیں‘ جبکہ رہبانیت کی راہ میں اٹھائی گئی تکالیف سے دنیا اور اہلِ دنیا کو کسی قسم کا فائدہ پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ بہرحال شیطان کا یہ وار عیسائیت کے حوالے سے بہت کارگر ثابت ہوا۔ اس کے نتیجے میں عیسائیوں کے ہاں نہ صرف خانقاہی نظام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ’’رہبانیت‘‘ اعلیٰ ترین ذریعہ اور وسیلہ قرار پائی۔

(History of Christian Monasticism پر لکھی گئی یورپین مصنّفین کی بڑی بڑی ضخیم کتابیں عیسائی راہبوں اور رہبانیت کے بارے میں عجیب و غریب تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔)

اس کے بعد اسلام میں جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی اور احیاءِ خلافت کی چند کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں تو مسلمانوں کے ہاں بھی رہبانیت کے طور طریقے رائج ہونا شروع ہو گئے۔ اس کی عملی صورت یہ سامنے آئی کہ مخلص اہلِ ایمان اور اہلِ علم لوگ بادشاہوں اور سلاطین کے رویّے کی وجہ سے اُمّت کے اجتماعی معاملات سے لاتعلق ہو کر گوشہ تنہائی میں جا بیٹھے۔ البتہ ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے ان سے اکتسابِ فیض کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ اہل اللہ اور اہلِ علم کی مسندوں نے خانقاہوں کی شکل اختیار کر لی۔ سلاطین و اُمراء نے اپنے مفاد کے لیے ان خانقاہوں کی سرپرستی کرنی شروع کر دی۔ ایسی خانقاہوں کے لیے بڑی بڑی جاگیریں مختص کر دی گئیں تاکہ خانقاہ اور اس سے متعلقہ تمام لوگوں کے اخراجات احسن طریقے سے پورے ہوتے رہیں اور یہ لوگ حکومت کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کے بجائے اطمینان کے ساتھ چلّہ کشیوں اور اپنی روحانی منازل طے کرنے میں مصروف و مشغول رہیں۔ دوسری طرف ان خانقاہوں سے متعلقہ لوگوں کے ہاں بھی رفتہ رفتہ دین و دنیا کا یہ تصوّر جڑ پکڑتا گیا کہ حکومت کرنا اور اجتماعی معاملات نپٹانا سلاطین و اُمراء کا کام ہے‘ ہمیں ان معاملات سے کیا سروکار؟ ہمارا کام تو دینی تعلیمات کی اشاعت اور لوگوں کی روحانی اصلاح کرنا ہے‘ تاکہ وہ اچھے مسلمان اور اللہ کے مقرّب بندے بن سکیں۔ یوں دین اسلام کا اصل تصوّر دھندلاتا گیا اور اس کی جگہ خانقاہی نظام کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ دین کا درست تصوّر اور انبیاء و رسل علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد تو وہی ہے جو ہم گزشتہ آیت میں پڑھ چکے ہیں: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ

بِالْقِسْطِ﴾ ’’تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں۔‘‘

چنانچہ آئندہ آیات میں ایک تو یہ نکتہ واضح کیا گیا ہے کہ انسانیت نے ’’رہبانیت‘‘ کا غلط موڑ کب اور کیسے مڑا‘ اور ساتھ ہی مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو! بے شک دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنا اور دنیا کے مقابلے میں آخرت بنانے کی فکر اختیار کرنا ہی دین کا اصل جوہر ہے‘ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم راہب بن کر تمدن کی زندگی کو خیرباد کہہ دو‘ بن باس لے لو‘ اور جنگلوں میں جا کر چلّے کاٹنا شروع کر دو‘ پہاڑوں کی چوٹیوں اور غاروں میں جا کر تپسیائیں کرو‘ یا خانقاہوں میں گوشہ نشین ہو جاؤ۔ تمہیں تو دنیا کی منجدھار میں رہتے ہوئے دوسروں کو زندگی کی ضمانت فراہم کرنی ہے۔ تمہیں تو جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے دنیا میں حق کا بول بالا کرنا ہے۔ ظلم و ناانصافی کو جڑ سے اکھاڑ کر معاشرے میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنا ہے‘ اور اپنے اردگرد ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں مظلوم کو اُس کا حق ملے اور ظالم کو سر چھپانے کی جگہ نہ مل سکے۔ اس کے لیے تمہارے سامنے اُسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قائم کردہ معیار بطورِ نمونہ موجود ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عرب کے معاشرے کو حق و انصاف کا جو معیار عطا کیا تھا اس کی جھلک حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کی اس تقریر میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جو آپؓ نے لوگوں سے بیعت خلافت لینے کے فوراً بعد کی تھی۔ آپؓ نے بحیثیت امیر المؤمنین اپنے پہلے خطاب میں عدل و انصاف کے بارے میں اپنی ترجیح واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا: ’’لوگو! تمہارا کمزور شخص میرے نزدیک بہت قوی ہو گا جب تک کہ مَیں اُسے اُس کا حق نہ دلوا دوں اور تمہارا قوی شخص میرے نزدیک بہت کمزور ہو گا جب تک کہ مَیں اُس سے کسی کا حق وصول نہ کر لوں‘‘۔ اسی طرح اس ضمن میں حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ بھی بہت اہم ہیں جو آپؓ نے ایرانی افواج کے سپہ سالار رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔ قادسیہ کے محاذ پر اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جنگ سے پہلے ایرانیوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ رستم نے ان سے سوال کیا تھا کہ تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟ اس پر انہوں نے اپنے مشن کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:

اِنَّ اللّٰہ ابتعثنا لنخرج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ ربِّ العباد‘

ومن ضیق الدُّنیا الی سِعَۃ الآخرۃ ومن جور الادیان الی عدل الاسلام

''ہمیں اللہ نے بھیجا ہے تاکہ ہم بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے رب کی غلامی میں لے آئیں' اور انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی کشادگی سے ہم کنار کریں' اور باطل نظاموں سے نجات دلا کر اسلام کے عادلانہ نظام سے روشناس کرائیں۔''

یہ ہے اس مضمون کا لُبِّ لُباب جو اس سورت کے آخر میں مرکزی مضمون کے ضمیمے کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اب اگلی آیت سے اس مضمون کی تمہید شروع ہو رہی ہے۔

آیت ۲۶ ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ﴾ ''اور ہم نے ہی بھیجا تھا نوحؑ کو بھی اور ابراہیمؑ کو بھی''

﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ ''اور ہم نے انہی دونوں کی نسل میں رکھ دی نبوت اور کتاب''

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر عذاب کے بعد انسانیت کی نسل حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں حضرت سامؑ' حضرت حامؑ اور حضرت یافثؑ سے چلی تھی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو انبیاء بھی آئے وہ آپؑ ہی کی نسل سے تھے۔ البتہ قرآن میں صرف سامی رسولوں کا تذکرہ ہے' آپؑ کے دوسرے دو بیٹوں کی نسلوں میں مبعوث ہونے والے پیغمبروں کا ذکر قرآن میں نہیں آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود بھی حضرت نوح علیہ السلام ہی کی نسل سے تھے' لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں جو انبیاء و رسل علیہم السلام آئے ان کا ذکر قرآن میں تخصیص کے ساتھ آپؑ کی نسل یا ذُرّیت کے حوالے سے ہوا ہے۔ آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گزرے تقریباً پانچ ہزار برس ہو چکے ہیں۔ اس دوران آپؑ کی اولاد کہاں کہاں پہنچی اور کس کس علاقے میں آباد ہوئی' یہ اپنی جگہ تحقیق کا ایک مستقل موضوع ہے' لیکن اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؑ کی نسل جس جس علاقے میں بھی آباد ہوئی ان تمام علاقوں میں انبیاء آتے رہے۔

﴿فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۶﴾ ''تو ان (کی نسل) میں کچھ تو ہدایت یافتہ بھی ہیں' لیکن ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے۔''

آیت ۲۷ ﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ﴾ ''پھر ہم نے بھیجے ان کے نقشِ قدم پر اپنے بہت سے رسولؑ اور پھر

ان کے پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو اور اُسے ہم نے انجیل عطا فرمائی''

آیت ۲۶ اور ۲۷ میں حضرت نوحؑ' حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء و رسل علیہم السلام کا ذکر تمہید کے طور پر آیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اصل میں یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جن کے پیروکاروں نے رہبانیت کی ابتدا کی تھی۔

﴿وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ﴾ ''اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ہم نے ان کے دلوں میں بڑی نرمی اور رحمت پیدا کر دی۔''

رأفت اور رحمت ملتے جلتے مفہوم کے دو الفاظ ہیں۔ رأفت دراصل وہ انسانی جذبہ ہے جس کے تحت انسان کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ بقول امیر مینائی ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

یعنی یہ جذبۂ رأفت ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کسی کے درد کو اپنا درد سمجھتا ہے' جبکہ رحمت کا جذبہ انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ دوسرے انسان کی تکلیف دور کرنے کے لیے کوشش کرے۔ گویا رأفت کا جذبہ بنیادی طور پر انسان کے دل میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اس کے ردِّعمل (reflex action) کا اظہار جذبۂ رحمت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے رأفت اور رحمت باہم تکمیلی (complementary) نوعیت کے جذبات ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا تصدیق فرمائی گئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کے دلوں کو خصوصی طور پر رأفت و رحمت کے جذبات سے مزیّن کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود بھی مزاج کے اعتبار سے انتہائی نرم اور رقیق القلب تھے' آپؑ کی شخصیت میں سختی کا عنصر بالکل نہیں تھا۔ آپؑ کی شخصیت کے اس پہلو کا اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ آپؑ نے ایک شخص کو چوری کرتے دیکھا تو پوچھا کہ کیا تم چوری کر رہے ہو؟ اس نے کہا: نہیں مَیں چوری تو نہیں کر رہا۔ آپؑ نے فرمایا: اچھا تو پھر میری آنکھ نے غلط دیکھا ہے۔ چنانچہ آپؑ کی شخصیت کے زیر اثر آپؑ کے حواریین کی طبیعتوں میں بھی رأفت' رحمت' رقتِ قلب اور شفقت کے غیر معمولی جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ جذبات بلاشبہ اپنی جگہ مستحسن ہیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ میں فرمایا ہے کہ آپؐ اہلِ ایمان کے حق میں بہت نرم دل اور شفیق ہیں: ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ

رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۷﴾ (رأفة اور رء وف ایک ہی مادے سے ہیں)۔ بہرحال شیطان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے مزاج کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن کے ان جذبات کا رخ رہبانیت کی طرف موڑ دیا۔

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا﴾ ''اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی تھی''

﴿مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾ ''ہم نے اسے اُن پر لازم نہیں کیا تھا مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں''

اس فقرے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ رہبانیت انہوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اختیار کی تھی‘ اس میں ان کی کسی بدنیتی کا عنصر شامل نہیں تھا۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم نے تو ان پر کچھ لازم نہیں کیا تھا سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی رضا تلاش کریں۔ لیکن انہوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے نفس کُشی (self annihilation)‘ ترکِ دنیا‘ رہبانیت اور تجرد (بغیر نکاح کے) کی زندگی بسر کرنے کا راستہ اختیار کر لیا۔ بہرحال حقیقت میں یہ اللہ کی رضا کا راستہ نہیں تھا۔ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا درست راستہ تو جہاد کا راستہ ہے: ﴿وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ﴾ (المائدۃ:۳۵) ''اللہ کا قرب تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو!'' یعنی باطل کو ملیامیٹ کرنے‘ حق کو غالب کرنے‘ ظلم و ناانصافی کو اکھاڑ پھینکنے اور عدل و قسط کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے مجاہد بن جاؤ! اس راستے پر چلتے ہوئے جان و مال کی قربانیاں دو‘ فاقے برداشت کرو اور ہر طرح کی تکالیف و مشکلات کا سامنا کرو۔ بہرحال شیطان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو اللہ کے مقرب بننے اور اُس کی رضا تلاش کرنے کا یہ راستہ اُن کی نظروں سے اوجھل کر کے رہبانیت کے راستے پر ڈال دیا تاکہ اللہ کے نیک اور مخلص بندے تمدن کے معاملات سے لاتعلق رہیں اور معاشرے کے اندر ابلیسیت کے ننگے ناچ کو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو۔ دنیا میں ظالموں اور شریروں کو کھلی چھوٹ حاصل ہو اور ان کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو۔ علّامہ اقبال نے ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں اس کی بہترین تعبیر کی ہے کہ ابلیس نے اپنے چیلے چانٹوں کو ہدایات دیتے ہوئے ''مؤمن'' کے بارے میں کہا کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾ ''پھر وہ اس کی رعایت بھی نہ کر سکے جیسا کہ اس کی رعایت کرنے کا حق تھا۔''

دراصل انسان کے لیے اپنے اوپر کوئی غیر فطری پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کر لینا تو آسان ہے مگر پھر ساری عمر اس فیصلے کو نبھانا بہت مشکل ہے۔ یہی مشکل رہبانیت کا راستہ اختیار کرنے والے لوگوں کو پیش آئی۔ راہب اور راہبائیں بظاہر تو مجرد زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے‘ لیکن پھر فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر زناکاریوں میں ملوث ہو جاتے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ راہب خانوں کے تہہ خانے حرامی بچوں کے قبرستان بن گئے۔ History of Christian Monasticism پر لکھی گئی کتابوں میں اس بارے میں لرزہ خیز تفصیلات ملتی ہیں۔ دراصل انسان کے جنسی جذبے کو غیر فطری طور پر دبانا ایسا ہی ہے جیسے بہتے دریا پر بند باندھنا۔ دریا کے پانی کو مناسب راستہ دے کر تو اس پر بند باندھا جا سکتا ہے لیکن دریا کے پورے پانی کو روکنا کسی طور پر بھی ممکن نہیں۔ ظاہر ہے اگر کہیں کوئی ایسی کوشش ہو گی تو اس کے خطرناک نتائج نکلیں گے۔ یہ لوگ خود تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کا جنسی جذبہ بہت منہ زور ہے۔ سگمنڈ فرائڈ عیسائیوں کے گھر کا آدمی ہے اور اس کی گواہی گویا ''شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا'' کا درجہ رکھتی ہے۔ انسان کے جنسی جذبے کو وہ تمام جذبات پر غالب اور باقی تمام جذبات کا محرک قرار دیتا ہے۔ اگرچہ میں ذاتی طور پر فرائڈ کے اس تجزیے سے متفق نہیں ہوں اور میری یہ رائے اکیلے فرائڈ یا اس کے اس تجزیے کے بارے میں ہی نہیں‘ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ بیشتر مغربی فلاسفر انسانی زندگی پر فلسفیانہ بحث کے دوران اکثر غلط بینی اور کج روی کا شکار ہو گئے ہیں۔ جیسے فرائڈ کو ہر طرف سیکس ہی سیکس نظر آیا‘ کارل مارکس کی نظریں انسان کے پیٹ پر مرکوز ہو کر رہ گئیں‘ جبکہ ایڈلر صاحب کو انسان کے بڑا بننے کا جذبہ (urge to dominate) ہی ہر طرف چھایا ہوا دکھائی دیا۔ بہرحال مذکورہ فلاسفرز نے اپنے اپنے مطالعے اور تجزیے میں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور بہت سے دوسرے اہم پہلوؤں کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کی ایسی آراء جزوی طور پر ہی درست تسلیم کی جا سکتی ہیں۔ بہرحال اگر یہ درست نہ بھی ہو کہ انسان کا جنسی جذبہ اس کے تمام جذبوں پر غالب اور اس کے باقی تمام جذبوں کا محرک ہے تو بھی اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ انسان کا یہ جذبہ بہت منہ زور ہے اور اس کو غیر فطری

طریقے سے قابو میں لانا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس جذبے کو نظم وضبط میں لانے کے لیے نکاح کا فطری راستہ تجویز کیا ہے۔ رہبانیت کے لیے اختیار کیے گئے طور طریقے زیادہ تر چونکہ غیر فطری تھے اس لیے اسے اختیار کرنے والے لوگ اس کا حق ادا کرنے میں بُری طرح ناکام رہے۔

﴿فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ﴾ ''تو ہم نے اُن میں سے اُن لوگوں کو اُن کا اجر دیا جو ایمان لے آئے۔''

ایک رائے کے مطابق یہ عیسائیوں کے ان لوگوں کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے کے زمانے میں صاحبِ ایمان تھے' لیکن اس سے ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ ان میں سے جو لوگ نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لا کر مسلمان ہو گئے انہیں ان کا اجر دیا جائے گا۔

﴿وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۷﴾ ''لیکن ان کی اکثریت فاسقوں پر مشتمل ہے۔''

آیت ۲۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اُس کے رسولؐ (محمد ﷺ) پر ایمان لاؤ!''

اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے ـــــ ایک تو یہ کہ یہاں ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' کا خطاب محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں سے ہے۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم محض زبان سے آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کر کے نہ رہ جاؤ بلکہ صدقِ دل سے ایمان لاؤ اور اپنے ایمان کو پختہ کرو۔ حضور ﷺ پر سچّے ایمان کا معیار آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اہلِ ایمان سے فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (آیت ۲۱) ''تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے''۔ تم لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے اُسوہ کو دیکھو' آپؐ کی زندگی کے معمولات کو اپنے لیے مشعل راہ بناؤ اور اپنی زندگیوں میں ویسا توازن پیدا کرو جیسا کہ آپؐ کی زندگی میں توازن تھا۔ دیکھو! حضور ﷺ نے ترکِ دنیا کا طریقہ نہیں اپنایا۔ آپؐ نے نکاح کیے' آپؐ کی اولاد بھی ہوئی' آپؐ نے بھرپور زندگی گزاری' اس کے باوجود آپؐ نے اپنی زندگی کی تمام توانائیاں اور تمام صلاحیتیں غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کی نذر کر دیں۔ تم پر بھی لازم ہے کہ تم لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے اس اُسوہ کی پیروی کرو۔

حضور ﷺ کے اسوہ کے حوالے سے یہ اہم نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ جیسے آپؐ کا

اتّباع ضروری ہے' ویسے ہی اس اتّباع میں توازن قائم کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر کسی نے حضور ﷺ کی تمام سُنّتوں کو اپنا لیا لیکن اتّباع کرتے ہوئے ہر سُنّت کی مطلوبہ ترجیح اور اہمیت کا خیال نہ رکھا تو گویا وہ شخص حضور ﷺ کے اُسوہ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا۔ اس نکتہ کو اس مثال سے سمجھیں کہ ایک طبیب نے آپ کو چند دوائیوں پر مشتمل ایک نسخہ لکھ کر دیا۔ ان میں سے ایک دوائی کا مطلوبہ وزن ایک چھٹانک ہے' دوسری کا ایک تولہ اور تیسری کا ایک ماشہ۔ اب اگر آپ اپنی پسند سے تولہ والی دوائی کا وزن ایک چھٹانک کر لیں اور چھٹانک والی دوائی کا وزن ایک تولہ کر لیں تو وہ نسخہ' نسخہ شفا نہیں رہے گا' نسخہ ہلاکت بن جائے گا۔ اس لیے صرف یہ اطمینان کافی نہیں کہ فلاں عمل آپ ﷺ کی سُنّت سے ثابت ہے' بلکہ سُنّت وسیرتِ نبویؐ کو اس اعتبار سے دیکھنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے اپنی زندگی مجموعی طور پر کس طرح گزاری۔ آپؐ کی زندگی میں کس چیز کی کتنی اہمیت تھی؟ آپؐ نے کس عمل کو کتنا وقت دیا؟ آپؐ کی ترجیحات کیا تھیں؟ آپؐ کی ترجیحات میں بنیادی نوعیت کی چیزیں کون سی تھیں اور کون سی چیزوں کو ثانوی حیثیت حاصل تھی؟ واضح رہے کہ اگر کسی نے حضور ﷺ کے اُسوہ کا اتباع کرتے ہوئے اس اعتبار سے توازن برقرار نہ رکھا تو اس کا طرزِ عمل حضور ﷺ کے اُسوہ کے اتباع کے بجائے ذاتی پسند وناپسند کا معاملہ بن جائے گا۔

سیاق وسباق کے اعتبار سے آیت زیر مطالعہ کے اس حصّے کا ایک مفہوم اور بھی ہے۔ پچھلی آیت میں چونکہ اہلِ کتاب کا ذکر ہے' اس لیے اس حوالے سے اس خطاب کا رخ اہلِ کتاب کی طرف بھی ہے۔ اس پہلو سے اس فقرے کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں سے جن لوگوں کے اندر اپنے سابقہ ایمان کی کچھ رمق موجود ہے' ان سے کہا جا رہا ہے کہ اے وہ لوگو جو پہلے سے اللہ پر ایمان رکھتے ہو اب اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہوئے اُس کے آخری رسول ﷺ پر بھی ایمان لے آؤ! اگر تم ایسا کرو گے تو:

﴿يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ﴾ ''وہ تمہیں دہرا حصّہ عطا کرے گا اپنی رحمت سے''

اہلِ کتاب کے ایسے لوگوں کے لیے ہم سورۃ القصص میں بھی یہ خوشخبری پڑھ چکے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ﴾ (آیت ۵۴) کہ اگر یہ لوگ نبی آخر الزماں ﷺ پر

ایمان لائیں گے تو انہیں دہرا اجر ملے گا۔

﴿وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ﴾ ”اور وہ تمہیں ایسا نُور عطا فرمائے گا جس کو لے کر تم چل سکو گے“

اس سے ایک تو وہ نُور مراد ہے جس کا ذکر قبل ازیں آیت ۱۲ میں ہو چکا ہے کہ پُل صراط سے گزرتے وقت تمہیں نُور عطا کیا جائے گا جس کی مدد سے تم آسانی سے جنّت میں پہنچ جاؤ گے۔ لیکن اس کے علاوہ اس سے مراد یہاں ایمان بالرسول اور اُسوۂ رسولؐ کے اتباع کا وہ نُور بھی ہے جو اہلِ ایمان کو دنیوی زندگی میں بھی نصیب ہوتا ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے آیت کے الفاظ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ کو ذہن میں دوبارہ تازہ کر لیں اور سمجھ لیں کہ یہاں اصل زور (emphasis) ایمان بالرسولؐ پر ہے۔ اس حوالے سے آیت کے اس حصّے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر تم لوگ اُسوۂ رسولؐ کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تمہیں عملی زندگی میں ایک ایسی روشنی عطا ہوگی جو تمہیں کبھی بھٹکنے نہیں دے گی۔ خاص طور پر تم رہبانیت جیسی بدعت میں ملوث ہونے سے محفوظ رہو گے۔ چونکہ زیر مطالعہ آیات کا تعلق اقامتِ دین اور اقامتِ عدل وقسط کے مضمون سے ہے اس لیے سیاقِ مضمون کے اعتبار سے آیت کے اس حصّے میں یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ اگر تمہیں نظامِ عدل وقسط کے قیام کی منزل پر پہنچنے کے لیے رہنمائی اور روشنی درکار ہے تو وہ تمہیں ایمان بالرسولؐ اور منہجِ انقلابِ نبویؐ سے ملے گی۔ اور اگر تم نے اپنا یہ ایمان پختہ کر لیا اور منہجِ نبویؐ کو اپنا راستہ بنا لیا تو اس راستے پر ہم تمہیں ایسا نُور عطا کریں گے جس کی راہنمائی میں تمہارے لیے کسی غلطی، کوتاہی یا منزل سے بھٹکنے کا کوئی امکان نہیں رہے گا —— چنانچہ اگر ہمیں عدل وقسط کے قیام کے لیے انقلاب برپا کرنے کی جِدّوجُہد کرنی ہے (دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس جِدّوجُہد میں اپنا تن من دھن کھپا دینے کی توفیق عطا فرمائے!) تو ہمیں اس کے لیے روشنی اور راہنمائی انقلابِ نبویؐ کے منہج سے حاصل ہوگی۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر ہم حضور ﷺ کے راستے سے ہٹ کر کوئی راستہ اختیار کریں گے تو کبھی منزل پر نہیں پہنچ پائیں گے: ؎

خلافِ پیمبرؐ کسے راہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

سورۃ المائدۃ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ﴾ (آیت ۴۸) کہ ہم نے تم میں سے سب کے لیے علیحدہ علیحدہ شریعتیں اور علیحدہ علیحدہ منہاج بنائے ہیں۔ اب یہ ہماری ذِمّہ داری ہے کہ ہم اپنے نبی ﷺ کا منہاج تلاش

کریں اور جب تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ ”جا ایں جاست!“ (جس جگہ کی ہمیں تلاش ہے وہ جگہ یہی ہے۔) یعنی ہمیں راہنمائی چاہیے، ہدایت چاہیے یا غلبۂ دین کی جِدّوجُہد میں کامیابی چاہیے تو یہ سب کچھ ہمیں سیرتِ محمدیؐ سے ہی ملے گا۔ اس یقین کے بعد ہمیں اپنا تن من دھن سیرتِ محمدیؐ کے اتّباع میں کھپا دینے پر کمربستہ ہو جانا چاہیے اور ایسا کرتے ہوئے ہمیں زیرزمین تیل تلاش کرنے والی کمپنی کی مثال پیش نظر رکھنی چاہیے۔ ایسی کسی کمپنی کے ماہرین کو اگر کسی جگہ کے بارے میں گمان ہو کہ یہاں سے تیل ملنے کا امکان ہے تو وہ صرف اس گمان اور امکان کی بنیاد پر کروڑوں روپے اس جگہ کی ڈرلنگ پر صَرف کر دیتے ہیں۔ لیکن ہمارا تو ایمان ہے، ہمیں تو یقین ہے کہ ”جا ایں جاست“۔ تو پھر ہم کیوں نہ اپنا سب کچھ اس راہ میں نچھاور کر دیں!

﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٨﴾﴾ ”اور وہ تمہیں بخش دے گا، اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔“

اگر تم لوگوں نے منہاجِ محمدیؐ کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنا لیا تو تمہارا رخ سیدھا ہو گیا، مجموعی طور پر تم سیدھے راستے پر آ گئے۔ اب اگر اس راستے پر چلتے ہوئے کوئی خطا یا کوئی لغزش ہو گی تو توبہ کا دروازہ کھلا ہے:

﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ (النساء:۱۷)

”اللہ کے ذمے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو کوئی بُری حرکت کر بیٹھتے ہیں جہالت اور نادانی میں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، تو یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔“

چنانچہ اگر تم سچّے دل سے توبہ کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری خطائیں اور لغزشیں معاف کرتا رہے گا۔ وہ بہت بخشنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾

”(یہ اس لیے ہے) تاکہ اہلِ کتاب یہ نہ سمجھ لیں کہ اللہ کے فضل پر اب ان کا کوئی حق نہیں ہے“

گزشتہ آیت کی تشریح کے دوران میں نے ذکر کیا تھا کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا

اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ﴾ کے خطاب کا رخ اہلِ کتاب کی طرف بھی ہے۔ یہ بات اس آیت میں اب بالکل واضح ہوگئی ہے۔ جن مفسّرین کا ذہن اس طرف نہیں گیا (کہ گزشتہ آیت میں خطاب کا رخ اہلِ کتاب کی طرف بھی ہے) انہیں زیرِ مطالعہ آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ یہاں لِئَلَّا میں لَا زائد ہے اور اصل میں یہاں مراد لِکَیْ یَعْلَمَ ہے۔ چونکہ ان لوگوں کے نزدیک گزشتہ آیت صرف مسلمانوں سے خطاب کر رہی ہے' اس لیے انہوں نے زیرِ مطالعہ آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''تاکہ اہلِ کتاب کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اب انہیں کوئی قدرت حاصل نہیں ہے اللہ کے فضل پر۔''

بہرحال میں نے گزشتہ آیت میں اہلِ کتاب سے خطاب کے پہلو کو مدِّنظر رکھتے ہوئے زیرِ مطالعہ آیت کا جو ترجمہ کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ کتاب یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کے لیے اب اللہ کے فضل کے حصول کا کوئی راستہ رہا ہی نہیں' بلکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے لیے راستہ تو اب بھی کھلا ہے۔ وہ آئیں' خود کو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں ڈال دیں' قرآن پر ایمان لائیں اور اللہ کے فضل میں حصّہ دار بن جائیں۔ یہی بات انہیں سورۂ بنی اسرائیل میں بھی بایں الفاظ کہی گئی ہے: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ﴾ (آیت ۸) ''ہوسکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے''۔ یعنی بے شک تم اللہ کے بہت لاڈلے تھے اور اب تم اپنے طرزِ عمل کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہو گئے ہو' لیکن تمہارا ربّ اب بھی تم پر رحمت فرمانے پر آمادہ ہے۔ بس تم آخری نبی حضرت محمد ﷺ اور آخری آسمانی کتاب قرآن پر ایمان لے آؤ اور اُس کی رحمت کے مستحق بن جاؤ۔ بلکہ اس سے اگلی آیت میں مزید واضح فرما دیا گیا: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ (آیت ۹) ''یقیناً یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اُس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے''۔ اب ہدایت کا ''شاہ درہ'' تو بس قرآن ہی ہے' چنانچہ آؤ اور اس راستے سے ہوتے ہوئے اللہ کے قصرِ رحمت میں داخل ہو جاؤ۔ بہرحال آیت زیرِ مطالعہ میں اہلِ کتاب پر واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے دروازے ان پر بند نہیں ہو گئے' یہ دروازے ان کے لیے اب بھی کھلے ہیں۔

﴿وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۹﴾ ''اور فضل یقیناً اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔'' ❁❁❁

ذکر اللہ کی فضیلت اور حقوق العباد کی سنگینی

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

زمین‘ آسمان اور جو کچھ ان میں ہے‘ اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ کائنات میں بے شمار مخلوق ہے۔ پہاڑ‘ سمندر‘ جاندار‘ بے جان اور نباتات اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں۔ اس ساری مخلوق میں انسان سرفہرست ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عقل وشعور سے نوازا ہے اور اچھائی اور بُرائی کی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ وہ بُرے کام بھی کرسکتا ہے جن میں وقتی لذّت ہے اور اچھے کام بھی کرسکتا ہے جن کے لیے اکثر اوقات مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نیک کام پسند ہیں۔ اس نے اپنے بندوں کو بتادیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں اچھے کام کرنے والوں کو آخرت کی زندگی میں وہ لذت اور راحت ملے گی جس کا تصوّر بھی اس وقت نہیں کیا جاسکتا اور وہ زندگی کبھی ختم نہ ہوگی۔ اس کے برعکس بُرائیاں کرنے والوں کو سخت قسم کے عذاب میں ڈالا جائے گا۔

جب انسان اللہ تعالیٰ کی بے پناہ عظمت کا احساس کرتا ہے اور اپنی زبان سے اس کا اقرار کرتا ہے تو اسے اللہ کا ذکر کہتے ہیں۔ چونکہ اللہ کا ذکر اعلیٰ درجے کی سچائی ہے‘ اس لیے یہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور اس سچائی کا اظہار کرنے والوں کو وہ پائیدار نعمتوں کی خوشخبری دیتا ہے جنہیں قرآن مجید میں جنت کہا گیا ہے۔ اللہ کے ذکر کی یہ عظمت ہے کہ جو ایسا کرتے ہیں اللہ ان کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۵۲) ”تم میرا ذکر کرو‘ مَیں تمہارا ذکر کروں گا“۔ پھر حدیثِ قدسی میں ہے کہ تم میرا ذکر جن کے سامنے کرو گے مَیں اُن سے بہتر لوگوں میں تمہارا ذکر کروں گا‘ یعنی اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہے گا میرا یہ بندہ عارف باللہ ہے‘ میری عظمت کا قائل ہے اور اپنی خوشی سے میری رضا کا طالب ہے۔ چونکہ اللہ کا ذکر

سب سے بڑی نیکی ہے‘ اس لیے یہ عمل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا نصیب ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ (العنکبوت:۴۵) ”اور اللہ کا ذکر سب اچھائیوں سے بڑی اچھائی ہے“۔ جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا جہاد افضل ہے تو آپؐ نے فرمایا: ”جس میں اللہ کا ذکر کثرت سے ہو“۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ بندے اس کی رضا حاصل کرکے ابدی نعمتوں سے متمتع ہوں اس لیے اس نے ذکر کے کلمات بھی انسان کو بتادیے ہیں۔ ظاہر ہے ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے گا تو وہ اسے اچھا لگے گا۔

مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو جملے اللہ تعالیٰ کو بڑے پسند ہیں۔ وہ زبان سے ادا کرنے میں تو بڑے سہل ہیں مگر میزان میں ان کا وزن بھاری ہوگا‘ وہ کلمے یہ ہیں: ((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ))۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے کلمات جو آپؐ نے اُمّت کو تعلیم فرمائے‘ بڑے اجر کا باعث ہیں۔

قرآن مجید تو سراسر اللہ کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ⑨﴾ (الحجر) ”ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں“۔ اس ذکر اعظم کو اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی تبدیلی اور تحریف سے محفوظ کردیا۔ یہ قیامت تک لوگوں کو اسی طرح پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے‘ اس لیے اس نے اپنے اس ذکر کو محفوظ بنادیا اور سہل بھی۔ ہر مسلمان کے گھر میں قرآن مجید کے نسخے موجود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِقْرَؤُ الْقُرآن فَاِنَّكُمْ تُوجَرُوْنَ عَلَيْهِ، اما اِنِّي لَا اَقُوْلُ الم حَرف وَلٰكِنْ الف عَشر و لَام عَشر وَ مِيم عشر فَتِلْكَ ثَلَاثُوْنَ)) (سلسلة الصحيحة:۲۷۷۱)

”قرآن پڑھا کرو کیونکہ تمہیں اس پر اجر دیا جاتا ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے۔ الف کی دس نیکیاں ہیں‘ لام کی دس نیکیاں ہیں اور میم کی دس نیکیاں ہیں۔ اس طرح یہ کُل تیس نیکیاں ہوئیں۔“

اسی مضمون کی ایک حدیث ترمذی میں موجود ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت نیکیاں کمانے کا کتنا سہل ذریعہ ہے۔ جب الم پر تیس نیکیوں کا ثواب ہے تو پورا قرآن پڑھنے پر کتنی نیکیاں ملیں گی! قرآن مجید

کے ہزاروں الفاظ لاکھوں حروف پر مشتمل ہیں۔ اکثر مسلمان کثرت سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں اور پوری زندگی میں کئی مرتبہ پورا قرآن پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ حافظِ قرآن تو حفظ کے دوران ہی متعدد دفعہ قرآن کی تلاوت کر لیتے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ صرف تلاوتِ قرآن کی نیکیاں جو ایک مسلمان پوری زندگی میں حاصل کر لیتا ہے‘ ان کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ اس بات کو حضور اکرم ﷺ نے یوں واضح کیا ہے کہ کچھ لوگ قیامت کے دن اس قدر نیکیاں لے کر آئیں گے کہ اگر انہیں پہاڑوں پر رکھا جائے تو پہاڑ بھی دب جائیں۔

تلاوتِ قرآن کے علاوہ نماز‘ روزے‘ ذکر و اذکار اور دیگر نیک کاموں کے ذریعے مسلمان کتنی ہی نیکیاں کما لیتے ہیں‘ لیکن اس کے باوجود بھی دوزخ سے بچنے کا خوف طاری رہتا ہے۔ بڑے بڑے عبادت گزار اور نیکوکار بھی ہمہ وقت بخشش کے طالب اور استغفار کرتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسے ارشادِ ربانی ہے: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ﴾ (ھود:۱۱۴) ’’نیکیاں بدیوں کو مٹا دیتی ہیں‘‘۔ اسی طرح بعض گناہ نیکیوں کو بھی بھسم کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ اَوْ قَالَ الْعُشْبَ)) (رواہ ابی داؤد عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ)

’’بے شک حسد نیکیوں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو یا فرمایا گھاس کو۔‘‘

قرآن مجید میں حاسد کی برائی سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ حاسد بدخواہ ہوتا ہے اور وہ محسود کو نقصان پہنچانے کے طریقے سوچتا ہے۔ دنیا کی زندگی میں لوگوں کے حقوق تلف کرنے والا اور حسد کرنے والا آخرت میں اپنی اَن گنت نیکیاں گنوا بیٹھتا ہے۔ جب اس کی نیکیاں ختم ہوں گی تو اس پر حق داروں کے گناہ آ پڑیں گے اور وہ عذاب کا مستحق ہو جائے گا‘ جبکہ اس کی نیکیاں اس کے کسی کام نہ آ سکیں گی اور وافر نیکیوں کے باوجود اسے عذاب میں ڈالا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلِسِ؟)) قَالُوْا : اَلْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ‘ فَقَالَ: ((اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِصَلَاةٍ

وَصِیَامٍ وَزَکَاةٍ وَیَاْتِیْ وَقَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَاَکَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَکَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا‘ فَیُعْطٰی هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ‘ فَاِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ یُّقْضٰی مَا عَلَیْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَایَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَیْهِ‘ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ)) (رواہ مسلم)

’’کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: مفلس ہم اس شخص کو سمجھتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ‘ مال و متاع نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’میری اُمّت میں مفلس وہ انسان ہے جو قیامت کے دن نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ‘ اعمال کے ساتھ آئے گا لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوگی‘ کسی پر تہمت طرازی کی ہوگی‘ کسی کا مال کھایا‘ کسی کا خون گرایا اور کسی کو مارا ہوگا تو اس مظلوم کو اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی اور دوسرے کو بھی اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی۔ اگر اس کے مظالم کی ادائیگی سے قبل اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو ان مظلوموں کی غلطیاں اس پر پھینک دی جائیں گی اور اسے جہنم میں گرا دیا جائے گا۔‘‘

یہ حدیث حقوق العباد کی سنگینی ظاہر کر رہی ہے کہ مرتے وقت کسی مؤمن پر حقوق تلف کرنے کا جرم نہ ہو۔ شہادت فی سبیل اللہ سب سے اونچے درجے کی نیکی ہے مگر رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ایک شہید کو بھی حقوق العباد کی تلفی معاف نہیں بلکہ اگر اس کے ذمہ دوسروں کے حقوق ہوں گے تو وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ میں (خطبہ دینے کے لیے) کھڑے ہوئے‘ اور فرمایا:

’’جہاد فی سبیل اللہ اور ایمان باللہ تمام اعمال سے افضل ہیں۔ ایک آدمی کھڑا ہوا۔ اس نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! بتایئے اگر مَیں اللہ کے راستہ میں قتل ہو جاؤں تو کیا میرے گناہ مجھ سے دور ہو جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’ہاں‘ اگر تُو اللہ کے راستہ میں شہید ہو جائے جبکہ تُو صبر کرنے والا‘ طلبِ ثواب کرنے والا‘ آگے بڑھنے والا ہو‘ پیٹھ پھیرنے والا نہ ہو۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: تم نے کیا کہا تھا؟ اس نے عرض کیا: بتایئے! اگر مَیں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے گناہ مجھ سے دور ہو جائیں گے؟ نبی ﷺ نے فرمایا: ’’ہاں اگر تُو قتل ہو جائے اور تُو صبر کرنے والا‘ ثواب کا ارادہ رکھنے والا‘ جنگ کی طرف متوجہ ہونے والا اور منہ پھیرنے والا نہ ہو‘ ہاں قرض معاف نہیں ہوگا۔ جبریلؑ نے مجھ سے یہ بات کہی ہے۔‘‘

اسی طرح حدیث میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ شرک کا گناہ ناقابلِ بخشش ہے۔ اس کے علاوہ حقوق العباد کا معاملہ ایسا ہے کہ حق دار کو ہر صورت حق ادا کرنا ہوگا۔ قیامت کے دن حساب کے وقت کسی شخص کے پاس نہ پائی پیسہ ہوگا' نہ سونا چاندی' نہ زمین مکان جس سے وہ لوگوں کا حق ادا کر سکے۔ لہٰذا اس کی نیکیاں حق داروں کو دی جائیں گی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((الدَّوَاوِيْنُ ثَلَاثَةٌ ' دِيْوَانٌ لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ الْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ' يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ' وَدِيْوَانٌ لَا يَتْرُكُهُ اللّٰهُ ظُلْمُ الْعِبَادِ فِيْمَا بَيْنَهُمْ حَتّٰى يَقْتَصَّ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ' وَدِيْوَانٌ لَّا يَعْبَأُ اللّٰهُ بِهٖ ظُلْمُ الْعِبَادِ فِيْمَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ اللّٰهِ' فَذَاكَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَآءَ عَذَّبَهٗ وَاِنْ شَآءَ تَجَاوَزَ عَنْهُ)) (رواه البيهقى)

''نامۂ اعمال تین طرح کے ہیں۔ ایک نامۂ عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نہیں بخشے گا' اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا یہ کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ دوسرا اعمال نامہ جس کو اللہ تعالیٰ نہیں چھوڑے گا وہ ہے بندوں کا آپس میں ظلم کرنا' یہاں تک کہ ایک دوسرے سے بدلہ لے۔ تیسرا اعمال نامہ جس کی اللہ تعالیٰ پروا نہیں کرے گا وہ ہے بندوں کا اپنے اور خدا کے درمیان ظلم کرنا' یہ اللہ کے سپرد ہے' اگر چاہے تو اسے عذاب دے اور چاہے تو اُس سے درگزر کرے۔''

پس جہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی والے کاموں سے اجتناب کرنا ضروری ہے وہاں دوسرے انسانوں کے حقوق بھی دنیا کی زندگی میں ہی ادا کرنا ہوں گے' ورنہ ان کا بدلہ نیکیوں کی صورت میں دینا پڑے گا۔ حقوق العباد کی سنگینی کے باعث ہر شخص کے لیے مرنے سے پہلے حق داروں کے حق ادا کرنا انتہائی ضروری ہے' خواہ وراثت کا معاملہ ہو یا بیوی کے مہر کا۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

''رَحمۃٌ لِّلعالَمین'' حضرت محمد ﷺ

احمد علی محمودی

رحمت

بہت سے الفاظ کے معانی ان کے متضاد لفظ کے معنی سے سمجھے جاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک لفظ ''رحمت'' ہے۔ رحمت معروف عربی لفظ ہے' جس کا متضاد غضب ہے۔ رحمت کا لفظ جب انسان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے انسان کا نرم و نازک دل والا' شفیق اور مہربان ہونا لیکن یہی لفظِ رحمت جب اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا دین و دنیا میں رحم' کرم' شفقت' مہربانی و احسان اور عفو و درگزر کرنا۔

عالمین

عالَمین جمع ہے عالَم کی اور لفظ عالَم خود جمع ہے' اس کا عربی زبان میں کوئی مفرد نہیں۔ لہٰذا عالمین سے مراد خالق کی جملہ مخلوقات ہیں۔ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف ربّ العالمین سے کروایا ہے وہاں نبی کریم ﷺ کو رحمۃ للعالمین کے لقب سے نوازا ہے۔ نبی کریم ﷺ صرف مسلمانوں یا کسی مخصوص بستی یا شہر کے لیے رحمت بن کر تشریف نہیں لائے' بلکہ آپ ﷺ کی رحمت کا دائرہ العالمین ہے۔ قرآن کریم نے رب تعالیٰ کی ربوبیت کا دائرہ بھی العالمین قرار دیا ہے۔ بعض مفسّرین نے ان عالمین کی تعداد چودہ ہزار اور بعض نے اٹھارہ ہزار بتائی ہے' جبکہ صحیح تعداد کا علم صرف رب تعالیٰ ہی کو ہے' جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ﴾ (المدثر:۳۱) ''اور تیرے رب کے لشکروں کی تعداد اُس (اللہ) کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

رحمۃٌ للعالمین

اس بات میں اہلِ تفسیر میں اختلاف ہے کہ کیا آپ ﷺ عالَم کے مؤمنین و کافرین سبھی

کے لیے رحمت ہیں یا فقط مؤمنین کے لیے! بعض مفسّرین فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی رحمت' عالم کے سبھی انسانوں کے لیے عام ہے۔ اس میں اہلِ ایمان کی تخصیص نہیں' بلکہ آپؐ کی رحمت سے عالمین کے سبھی مؤمن و کافر فیض یاب ہو رہے ہیں۔ اہلِ ایمان کے لیے تو رحمت یہ ہے کہ وہ آپؐ کی وجہ سے دولتِ ایمان و ہدایت سے مالا مال اور عمل صالح کے حسین و جمیل زیور سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ پھر آپؐ کی بعثت کی وجہ سے کُرّۂ ارض پر اللہ تعالیٰ کی عمومی گرفت جیسے کہ اُمم سابقہ کو کُلّی طور پر ہلاک کرتی رہی' وہ اس سے آپ ﷺ کی عمومی رحمت کے باعث محفوظ ہیں۔

نبوت و رسالت کا امتیاز

محسنِ انسانیت' حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کا امتیاز یہ ہے کہ رحمٰن و رحیم پروردگار نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا۔ اس حوالے سے ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۷﴾ (الانبیاء) ''اور ہم نے (اے محبوب ﷺ!) آپ کو تمام جہانوں کے لیے (سراپا) رحمت بنا کر بھیجا ہے۔'' قرآن کریم کی یہ آیتِ مبارکہ رحمۃ للعالمینؐ کی شانِ رحمت' آپؐ کے خصائل و شمائل اور اخلاقِ کریمانہ کا جلی عنوان ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ عزوجل کے تمام انبیاء و مرسلین سراپا ''رحمت'' تھے' مگر ''رحمۃ للعالمین'' نہیں تھے۔ ان کی شانِ رحمت اپنی قوم' اپنے علاقے' اپنے دور اور اپنے زمانے تک محدود تھی جب کہ رحمتِ مجسم' محسنِ عالَم حضرت محمد ﷺ کی رحمت و شفقت کا دائرہ ہر عہد' ہر زمانے' ہر قوم' اپنے پرائے' جملہ کائنات اور جملہ مخلوقات یہاں تک کہ تمام جہانوں اور دنیا و آخرت کو شامل ہے۔

تاریخ کا رخ بدل ڈالا

اللہ تعالیٰ نے امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کو قیامت تک کی عالم گیر انسانیت تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے مبعوث فرمایا۔ آپؐ نے یہ فرض ایسی یگانہ بصیرت کے ساتھ انجام دیا کہ تاریخ کا رخ بدل ڈالا۔ انتہائی ناموافق حالات میں اصحابِ صدق و صفا کی عملی تربیت کر کے ایسی محکم جماعت کا وجود بخشا جس نے ہر جگہ اللہ رب العزت اور نبی کریم ﷺ کی اطاعت

وفرماں برداری کا پیغام بڑے ہی احسن طریقہ پر پہنچایا۔ یہ نبی کریمؐ کی تعلیمات ہی تو تھیں جس نے صحرائے عرب میں اونٹ چرانے والوں کو تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کر کے ایسا مبلغ، بہادر اور مجاہد بنا دیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے قیصر و کسریٰ جیسی بڑی طاقتوں پر غلبہ پا لیا۔ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات ہر دور کے لیے مینارۂ نور ہیں جن کے اثرات دیکھ کر انسانی عقل یہ ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ ایسی تعلیمات فراہم کرنے والے عظیم قائد کو ''رحمۃ للعالمین'' ہی کہا جانا چاہیے۔

بہترین نمونہ

اللہ ربّ العزت نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱) ''تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔'' یہ آیت اس بات کی متقاضی ہے کہ ساری انسانیت زندگی کے ہر پہلو میں نبی کریم ﷺ ہی کو اپنا رہبر و رہنما بنائے۔ آپ ﷺ کے نقش پا کی اسی طرح پیروی کرے جیسے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے آپ ﷺ کی ہر ہر ادا کی یوں پیروی کی کہ تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے اصحابؓ کی ایسی تربیت کی کہ وہ آسمانِ اسلام کے درخشاں ستارے کہلائے اور ان کی روشنی نے پورے جہاں کو روشن کیا۔ یہ وہ جرنیل تھے جو صرف سلطنتوں ہی کے نہیں بلکہ دلوں کے بھی فاتح تھے۔ بقول شاعر ؎

خود نہ تھے جو راہ پہ، اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی، جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا!

محسنِ انسانیت ﷺ کی سیرتِ مبارکہ سے درجنوں ایسے واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں نبی مہربان ﷺ کی جانوروں، حیوانوں اور انسانوں پر رحمت و شفقت کے تذکرے موجود ہیں۔ اب قیامت تک انسانیت کے لیے حضور ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہی بہترین نمونہ ہے۔ وہ گھریلو زندگی ہو یا معاشرتی زندگی، اولاد سے برتاؤ ہو یا والدین کا ادب، غریبوں کے حقوق و تعلقات ہوں یا ہمسائے کے حقوق کی ادائیگی، اقلیتوں کے حقوق ہوں یا پھر حکمرانوں کا کردار، سپاہ سالار ہوں یا استاذ، عوام ہوں یا امام، الغرض ہر فرد کو سیرت رحمت للعالمین ﷺ سے

مستفید ہونا اور رہنمائی حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔

صبر و استقامت کا کوہِ گراں

وہ کون سا ظلم تھا جو کفار و مشرکین نے مکّہ مکرمہ میں سرکارِ دو عالم ﷺ اور آپؐ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ روا نہ رکھا ہو! جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی گئیں۔ آپ ﷺ پر پتھروں اور سنگ ریزوں کی بارش کی گئی۔ راستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپ ﷺ کا گلا گھونٹا گیا۔ نماز کی حالت میں آپ ﷺ پر اُونٹ کی اوجھڑی رکھ دی گئی۔ قتل کے منصوبے تیار کیے گئے۔ تین سال تک شعب ابی طالب میں محصور رکھا گیا جس میں ببول کے پتے کھا کر گزارہ کرنے کی نوبت آئی۔ طائف میں لوگوں نے اس قدر سنگ ریزی کی کہ نعلین مبارک خون سے چپک گئے۔ آپ ﷺ کو مکّہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی سکون و اطمینان سے نہیں رہنے دیا گیا اور طرح طرح کی یورشیں جاری رکھی گئیں۔ یہود کے ساتھ مل کر رحمتِ دو عالم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بند مہم چھیڑ دی گئی۔ فتح مکّہ کے موقع پر کُفّارِ مکّہ کو جب موت اپنے سامنے نظر آ رہی تھی اور انہیں خطرہ تھا کہ آج ان کی ایذا رسانیوں کا انتقام لیا جائے گا تو اس موقع پر سرکارِ دو عالم ﷺ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا:

''اے قریش کے لوگو! تمہیں کیا توقع ہے، اس وقت میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟'' انہوں نے جواب دیا: ہم اچھی ہی اُمید رکھتے ہیں، آپ ﷺ کریم النفس اور شریف بھائی ہیں اور کریم اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مَیں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آج تم سے کوئی بدلہ نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔'' (زاد المعاد، ۱/۴۲۴)

شانِ رحمت و رحمۃ للعالمینی

علامہ شبلی نعمانی حضرت محمد ﷺ کی شانِ رحمت اور رحمۃ للعالمینی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''حضور انور ﷺ کی ذات پاک تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر آئی تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا تھا کہ ''مَیں امن کا شہزادہ ہوں'' لیکن امن و سلامتی کے شہنشاہ اعظم حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ ہی نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا

رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ (الانبیاء) (محمد ﷺ) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ آپ ﷺ کے کاشانۂ رحمت میں دوست و دشمن‘ کافر و مسلم‘ بوڑھے‘ بچے‘ عورت‘ مرد‘ آقا و غلام‘ انسان و حیوان سب برابر کے حصہ دار تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’مَیں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔‘‘ آپ ﷺ نے دنیا کو پیغام دیا: ’’ایک دوسرے سے بغض وحسد نہ کرو‘ ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو‘ اور اے خدا کے بندو! سب آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔‘‘ (سیرت النبی‘ ج ۲‘ ص ۲۴۴)

جہاد: رحمتِ خداوندی

جہاد ایک عظیم دینی فریضہ ہے جو تا قیامت جاری رہے گا اور آنحضرت ﷺ نے اسے شروع و مشروع فرمایا۔ اس کے وجوب اور حضرت شارع علیہ السلام کے رحمت للعالمین ہونے میں کوئی تضاد نہیں‘ بلکہ اس میں انتہائی مناسبت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب بنی نوع انسان کی سعادت و رحمت کے لیے شریعت مطہرہ نبی خاتم ﷺ کو عطا فرمائی تو پھر اس نور کے پھیلنے میں رکاوٹ بننے والے عوامل اور دعوتِ رحمت للعالمین ﷺ کے راستے کے کانٹوں کو اکھاڑ پھینکنا‘ خود انسانیت کے لیے عینِ رحمت ہے۔ اسی لیے تو باری تعالیٰ نے حضرت رحمت للعالمین ﷺ کو حکم دیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ﴾ (التوبہ:۷۳) ’’اے نبی (ﷺ)! کفّار و منافقین سے جہاد کریں اور ان کے لیے شدت اختیار کریں‘‘ کیونکہ ﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾﴾ (الصّف) ’’یہ لوگ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے نور کو مکمل پھیلا کر رہے گا‘ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو‘‘

یہ رحمت للعالمین ﷺ کی انسانیت کے لیے رحمت ہے کہ وہ اللہ کے نور میں داخل ہونے والوں کے لیے راستہ ہموار کرنے میں کوشاں رہیں اور جہاد کریں تاکہ انسانیت کمال سکون و راحت سے اپنی حیاتِ دنیوی گزارے۔ گویا اللہ کی راہ میں آنحضرت ﷺ کا عملِ جہاد عین رحمت ہے۔

مدینہ کی اسلامی ریاست

یہ حقیقت ہے کہ حضرت رحمت للعالمین ﷺ کے تمام احکامِ شریعت‘ خواہ وہ عقائد و

عبادات سے متعلق ہوں یا انسانوں کے ساتھ معاملات سے متعلق‘ انسانیت کے لیے سراسر رحمت ہی رحمت ہیں۔ ہم اگر پاکستان کو مدینہ کی اسلامی ریاست کی مانند بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں سیرت النبی ﷺ کا ذوق شوق سے مطالعہ کرنا اور اسے اپنے تعلیمی نصاب کا لازمی حصہ بنانا ہوگا۔ نیز جس طرح اصحابِ رسولؓ اور سیرت نگاروںؒ نے ہم تک آقائے کریم ﷺ کی زندگی کے تمام گوشے پہنچائے ہیں‘ ہم بھی من وعن اسی طرح آقائے دو جہاں ﷺ کی سیرت اور اس کا پیغام پہنچانے میں سرگرم عمل ہوں تاکہ بھٹکی ہوئی انسانیت آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے تمام پہلوؤں سے کما حقہٗ رہنمائی حاصل کر سکے۔

اللہ ربّ العالمین ہمیں رحمۃ للعالمین ﷺ کے ادب و تعظیم‘ حقیقی محبت اور اطاعت و اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو‘ ویڈیو کیسٹس‘ سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

ہماری زبان، ہماری پہچان

مولانا عبدالمتین

اللہ ربّ العزت نے انسانی جسم میں اعضاء کی بناوٹ اور درستگی کے حوالے سے قرآن کریم میں ''تسویہ'' کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے:

﴿الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝۷﴾ (الانفطار)

''جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعضاء کو درست اور برابر کیا۔''

یعنی انسانی اعضاء ایک اندازے اور اٹکل کے طور پر نہیں بلکہ ہر عضو اپنی جگہ بھرپور افادیت کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور اس عضو کا انسانی جسم میں اسی خاص مقام میں ہونا ہی انسان کے لیے مفید اور بہتر ہے۔ انہی اعضاء میں ایک بہت بڑی نعمت ''زبان'' ہے جو انسانی کردار کی لفظی ترجمانی کرتی ہے۔

قرآن کریم میں ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝۴﴾ (الرحمٰن) کہہ کر اس نعمت کا بطور خاص ذکر فرمایا کہ رحمٰن وہ ذات ہے جس نے انسان کو قوتِ بیان اور قوتِ گویائی عطا کی۔ انسانی ذہن جو سوچتا ہے، اس کا اظہار سیکنڈ سے بھی کم درجے میں زبان پر الفاظ کی شکل میں آجاتا ہے۔ اللہ ربّ العزت نے انسان کو مختلف نعمتوں سے مالا مال فرمایا ہے لیکن ایک اصول بھی وضع فرما دیا:

﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝۸﴾ (التکاثر) ''پھر تم سے اس دن (میدانِ محشر میں) نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔'' یعنی ایسا نہیں کہ یہ نعمت مفت میں بن مانگے ملی تو احسان فراموش بن کر جیسے چاہا اس کا استعمال کرلیا، بلکہ انسان سے اس بات کا بھرپور تقاضا ہے کہ وہ اس نعمت پر عملی شکر کا مظاہرہ کرے۔ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ اس نعمت کا جیسا استعمال کرنے کا حق ہے ویسا استعمال کرے۔

اسی لیے زبان جیسی عظیم نعمت دے کر اس کے تقاضے بھی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ زبان کے ساتھ انسان کے فقط الفاظ کا تعلق نہیں بلکہ یہ انسانی کردار

کی آئینہ دار ہے اور بہت سے نیک و بد اعمال کا بھرپور تعلق اس زبان کے استعمال سے ہے۔

امام غزالیؒ نے ''احیاء العلوم'' میں تقریباً بیس بڑے گناہوں کا ذکر فرمایا ہے جن کا تعلق زبان سے ہے۔ مثلاً جھوٹ، گالی، غیبت، طعنہ زنی، تمسخر، چغلی، عیب جوئی، ناشکری، بدگوئی، لعنت، ملامت، فضول گوئی، شرک، کثرتِ کلامی، بہتان، تکبّر وغیرہ جیسی تمام روحانی بیماریوں کا زبان کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں الفاظ کی پہرہ داری کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝۱۸﴾ (قٓ)

''انسان اپنی زبان سے جو بھی الفاظ نکالتا ہے ان الفاظ کو ایک حاضر باش فرشتہ نوٹ کرلیتا ہے۔''

سورۃ الانفطار میں فرمایا:

﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝۱۱﴾

''تم پر اعمال کو محفوظ کرنے والے معزز فرشتے مقرر ہیں۔''

اس پہرہ داری کا مقصد یہ ہے کہ احتیاط سے بولو، کیوں کہ انسانی الفاظ ہوا میں اڑ کر ضائع نہیں ہو رہے بلکہ تمہارے منہ سے نکلنے والے تمام الفاظ نوٹ کیے جا رہے ہیں۔

انسان گرفت میں آنے سے ہمیشہ خوفزدہ رہتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر گفتگو کے دوران کسی کے سامنے voice recorder رکھا جائے تو چرب زبان انسان بھی اپنے الفاظ کو تول کر اور بنا سنوار کر منہ سے نکالتا ہے۔ اسی لیے اللہ ربّ العزت نے ''حافظین'' کا ذکر فرما کر سمجھا دیا کہ اگرچہ تمہارے سامنے کوئی ریکارڈر نہیں لیکن اس سے کئی گنا بڑھ کر چاق چوبند فرشتے اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔

انسان جب صبح سویرے اٹھتا ہے تو اعضائے انسانی ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہیں۔ تمام انسانی اعضاء زبان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

((اِذَا أَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَإِنَّ أَعْضَاءَه تُكَفِّرُ اللِّسَانَ؛ تَقُولُ: اتَّقِ اللّٰهَ فِيْنَا؛ فَإِنَّكَ إِنِ اسْتَقَمْتَ استَقَمْنَا' وَإِنِ اعوججتَ اْعَوَجَجْنَا)) (مسند احمد)

''اے زبان تم اکیلی ایک الگ حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ہم بھی تمہارے ساتھ ساتھ ہیں۔ لہٰذا جب تک تمہارا استعمال درست ہوتا رہے گا تب تک ہم بھی اپنا کام ٹھیک سے کرتے

رہیں گے، لیکن اگر تم میں ٹیڑھ پن آ گیا تو یہ کمی ہمیں بھی تمہارے ساتھ لے ڈوبے گی۔''

اسی طرح قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ﴾ (النور:۲۴)

''جس دن ان کے خلاف گواہی دیں گی ان کی زبانیں۔''

قیامت کے دن زبان بھی انسان کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دے گی اور بتائے گی کہ اس شخص نے میرا کیسے استعمال کیا۔ ایک روایت کے مطابق رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

((مَنْ يَضْمَنْ لِيْ مَابَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ اَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ))

(صحيح البخاری)

''جو شخص مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ اپنی زبان اور شرم گاہ کا غلط استعمال نہیں کرے گا تو میں ایسے شخص کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔''

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''اے معاذ! اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ حضرت معاذؓ سوال کرتے ہیں: یارسول اللہ ﷺ! کیا زبان کی وجہ سے بھی ہمارا مؤاخذہ ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: تمہاری ماں تمہیں گم کرے، بہت سے لوگ اس زبان کی وجہ سے جہنم میں اوندھے منہ پڑے ہوں گے۔'' (سنن الترمذی)

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے مسلمان کی تعریف بھی زبان و اعضاء سے تکلیف نہ پہنچانے والے کے عنوان سے فرمائی:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (صحيح البخاری)

''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔''

رسول اللہ ﷺ ذاتی معمولات میں اپنے قرابت داروں کے ساتھ کس قدر احتیاط پر عمل پیرا تھے، اس کی ایک جھلک اس روایت میں ملتی ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

خَدَمْتُ رسولَ اللهِ ﷺ عشْرَ سِنينَ، فَمَا قَالَ لِيْ: أُفٍّ قطُّ وَمَا قَالَ لِيْ لِشَيْءٍ صَنَعْتُه: لِمَ صَنعتَه؟ ولَا لِشَيءٍ تَرَكْتُه: لِمَ تَرَكْتَه؟ (صحيح البخاری)

''میں نے رسول اکرم ﷺ کی دس سال خدمت کی لیکن اس طویل عرصے میں آپؐ نے مجھے کبھی نہیں ڈانٹا، اور میں نے جو کام کر لیا اس کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ کیوں کیا

اور جو کام نہیں کیا اس کے بارے میں کبھی یہ نہیں کہا کہ کیوں نہیں کیا۔''

مشہور تابعی حضرت طاؤسؒ زبان کی اہمیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ: ''میری زبان ایک درندے کی طرح ہے جس کو میں نے روکا ہوا ہے، اگر میں اس درندے کو چھوڑ دوں تو یہ مجھ پر ہی حملہ آور ہو جائے گا۔'' یعنی زبان کی درندگی کا شکار خود صاحبِ زبان بن جاتا ہے۔ ذیل میں ہم کچھ ایسے مختصر نکات ذکر کرتے ہیں جو زبان کے استعمال میں ملحوظ رہنے چاہئیں۔

(۱) **بامقصد گفتگو:** جس گفتگو کا کوئی مقصد ہی نہ ہو بلکہ وہ بے ہنگم، وقت گزاری اور بغیر دھیان کے کی جا رہی ہے، ایسی گفتگو اور ایسی مجالس سے اپنے آپ کو دور رکھا جائے۔

بعض اوقات انسان اپنی طبیعت میں بشاشت اور تازگی کے لیے گپ شپ اور باہمی اُلفت و مزاح کی مجالس قائم کرتا ہے۔ ان کی مناہی نہیں کیوں کہ ایسی مجالس انسان کے بدن و ذہن کو تازگی بخشنے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔

(۲) **سیدھی بات:** قرآن کریم میں اللہ ربّ العزت ارشاد فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝﴾ (الاحزاب)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کیا کرو۔''

بات میں ٹیڑھ پن، طنز، طعنہ اور کئی ایک مطالب کا اندیشہ نہ ہو۔ کسی کو کہہ کر کسی کو سنانا، جملے کسنا، سوال کچھ جواب کچھ، ٹال مٹول اور لمبی مگر بے معنی گفتگو، یہ سب گفتگو کے غلط طریقے ہیں۔ اسی لیے فرمایا ایسی سیدھی بات کرو جس میں مقصدیت، جامعیت اور بھرپور معنویت پائی جائے۔

(۳) **گفتگو میں حسن اور نرمی:** اللہ ربّ العزت نے فرمایا:

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (البقرة:۸۳)

''لوگوں سے اچھی بات کرو۔''

اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ)) (صحيح البخاری)

''اچھی بات کا منہ سے نکالنا بھی صدقہ ہے۔''

یعنی جب انسان بولے تو اچھا بولے۔ اپنے منہ سے گندنہ انڈیلے بلکہ اس کی گفتگو سے لوگوں کی طبیعت خوش ہو جائے اور مخاطب کا دل چاہے کہ یہ مزید بولے۔

ہر بات کو کہنے کے اچھے اور برے دونوں طریقے ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی کہے کہ ''آپ کا

فون ٹھیک کام نہیں کر رہا'' اور کوئی کہے کہ ''آپ کا فون کم تر معیار کا ہے۔'' دونوں جملوں کا معنی ایک ہے لیکن اندازِ بیان مختلف۔ ایک جملہ بلند اخلاقی کا مظہر ہے اور دوسرا جملہ کم ظرفی کا۔ اسی طرح اللہ عزوجل نے گفتگو میں نرمی اختیار کرنے کا حکم دیا:

﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ﴾ (طٰہٰ:۴۴)

''تم دونوں فرعون سے نرمی سے بات کرنا۔''

وقت کے جابر اور ظالم حکمران فرعون کے پاس دو پیغمبر بھائی حضرات موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو بھیجا جا رہا ہے لیکن طرزِ گفتگو میں نرمی کی تلقین کی جا رہی ہے۔

(۴) نفرت انگیز گفتگو سے اجتناب: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

((بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا)) (صحیح مسلم)

''لوگوں میں خوشیاں بانٹو' نفرتیں مت پھیلاؤ۔''

ایسا نہ ہو کہ انسان جب بھی بولے تو مسائل کھڑے کرے بلکہ ایسی گفتگو ہو کہ جس میں لوگوں کے لیے خیر کا پہلو غالب ہو۔

گفتگو میں نفرت' بغض' حسد اور کینے کی آگ نہ چھلکے جس کی وجہ سے فرقہ واریت' پھوٹ اور توڑ جنم لے۔ ذرا تصوّر کریں کہ کتنا ہی کمال ہوگا اس گفتگو میں جس میں علوم' فنون' قرآن و حدیث' سیرت' تہذیب' تاریخ' مزاح' ادب' شاعری' معلوماتِ عامہ یا عام و خاص مشاورت پر بات ہوتی ہو اور کسی بھی مسلمان بھائی کی ذات' گھر یا فیملی موضوع نہ بنتی ہو!

(۵) مختصر اور پُراثر گفتگو: جب گفتگو مقصد اور ضرورت کے مطابق کی جائے گی تو وہ مختصر اور پُراثر ہوگی' بایں طور کہ جب بات کا مدّعا واضح ہو جائے تو اسے طول دینے کی ضرورت نہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

((اُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ)) (صحیح البخاری)

''اللہ نے مجھے جامع کلمات ادا کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان جوامع الکلم کو چہل حدیث کی صورت میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جمع فرمایا ہے۔ مثلاً ہمیں نیت اور عمل کا تعلق بتانے میں کم از کم پانچ منٹ چاہئیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) یوں بات آدھی سے کم سطر میں مکمل

ہو جاتی ہے۔ زیادہ بولنا اور مسلسل بولنا کم عقل ہونے کی علامت ہے' جس سے اپنی شخصیت اور اوروں کا وقت ضائع ہوتا ہے۔

(۶) اچھا سننا' اچھا بولنا: ہمارے معاشرے میں ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ ہم اچھی گفتگو اور اپنے مافی الضمیر کو بہتر انداز میں پیش کرنے کو باہمی گفتگو کا کمال سمجھتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق اچھی گفتگو کا راز فقط بولنے میں نہیں بلکہ بھرپور توجہ کے ساتھ سننے میں بھی ہے۔ لہٰذا آداب میں شامل ہے کہ فقط بولتے رہنا اچھا نہیں بلکہ اپنے مخاطب کو بھی موقع دینا' جب تک سوال مکمل نہ ہو سنتے جانا' بات کو بیچ سے نہ کاٹنا' بھری مجلس میں گفتگو کے بہانے لمبی تقریر کرنا' جب مخاطب بولے موبائل میں لگ جانا اور سرگوشی کرنا یہ سب کام صاحبِ ایمان کو زیب نہیں دیتے۔

(۷) اپنی زبان کو قابو کرنا: یقیناً زبان کا بے جا استعمال بہت سے مسائل پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بہترین طریقہ کار سمجھایا ہے جسے اختیار کر کے ہم اس آلے کا بخوبی استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

((مَنْ صَمَتَ نَجَا)) (سنن الترمذی)

''جس نے خاموشی اختیار کی وہ کامیاب ہوا۔''

اپنے آپ کو خاموشی اور سکوت کا عادی بنانا دراصل اپنی زبان کو خود پر مالک بنانے کے بجائے اس پر مالک بن جانے کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے ضرب المثل ہے: ''ایک چپ سو سکھ۔'' لہٰذا جب تک خاموشی ہے تب تک معاملات قابو میں ہیں۔ خاموشی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ایک شخص کچھ نہ بولے بلکہ ماہرین فرماتے ہیں کہ خاموش انسان کی زبان رکی رہتی ہے جبکہ ذہن بہت اچھی طرح چلتا رہتا ہے۔ وہ بھرپور توجہ کے ساتھ گفتگو سنتا رہتا ہے' خوب سمجھ کر اپنے جواب کو مدلّل کرتا ہے اور پھر مختصر مگر پُراثر بات کہہ کر اپنی خاموشی کو بہترین الفاظ کا لباس پہناتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی زبان کی صحیح معنوں میں حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور وہ ان تمام چیزوں اور باتوں سے رُک جائے جن سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ آمین!

❁❁❁

علمِ تفسیر کے مآخذ

بسلسلہ علمِ تفسیر اور مفسرین کرام (۶)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

علمِ تفسیر کے حوالے سے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ 'تفسیر قرآن' کے مآخذ کیا ہیں؟ یعنی وہ کون سے ذرائع ہیں جن کی مدد سے ہم کسی آیت کی صحیح تفسیر معلوم کر سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں قدرے تفصیل ذیل میں پیش خدمت ہے۔

سب سے پہلے تو یہ ذہن نشین کر لیں کہ آیاتِ قرآنی دو قسم کی ہیں۔ بعض آیات تو اتنی صاف' واضح اور آسان ہیں کہ جو بھی عربی زبان جاننے والا انہیں پڑھے گا' اسے ان کا مطلب فوراً سمجھ میں آجائے گا' چنانچہ ایسی آیات کی تفسیر میں کسی اختلافِ رائے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی آیات کی تفسیر کا مآخذ تو صرف لغت عرب ہے۔ عربی زبان پر ماہرانہ نظر اور عقلِ سلیم کے علاوہ ان کا مفہوم جاننے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ دوسری قسم ان آیات کی ہے جن میں کوئی اجمال' ابہام یا تشریحی دشواری پائی جاتی ہے' یا ان کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ان کے پورے پس منظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے' یا ان سے مشکل قانونی اور فقہی مسائل یا گہرے اسرار و معارف مستنبط ہوتے ہیں۔ ایسی آیات کی تشریح و توضیح کے لیے محض زبان دانی کافی نہیں' بلکہ اس کے لیے بہت سی معلومات اور دیگر مہارتوں کی بھی ضرورت ہے۔ اس قسم کی آیاتِ قرآنی کی تفسیر کے لیے درج ذیل چھ مآخذ ہیں:

(ا) قرآن مجید (ب) احادیث نبویہؐ (ج) اقوالِ صحابہ کرامؓ
(د) اقوالِ تابعینؒ (ہ) لغتِ عرب (و) عقلِ سلیم

ذیل میں ان تمام مآخذ کی کچھ تفصیل اور علمِ تفسیر میں ان کے مقام کے بارے میں مختصر معروضات پیش کی جا رہی ہیں۔

(ا) پہلا ماخذ' قرآن مجید

تفسیر قرآن کا ماخذِ اوّل خود قرآن کریم ہے' یعنی اس کی کچھ آیات بعض اوقات دوسری آیات کی تفسیر اور وضاحت کر دیتی ہیں' اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا۔

(۱) ایک جگہ کوئی بات مبہم انداز میں کہی جاتی ہے اور دوسری جگہ اس ابہام کو دُور کر دیا جاتا ہے' مثلاً سورۃ الفاتحہ میں ارشادِ ربّانی ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝﴾ ''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دیجیے' ان لوگوں کے راستے کی جن پر آپ نے انعام فرمایا''۔ یہاں سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ جن لوگوں پر اللہ کی طرف سے انعام فرمایا گیا ہے' ان سے کون لوگ مراد ہیں؟ لیکن دوسری جگہ سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ﴾ (آیت ۶۹) ''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء' صِدّیقین' شہداء اور نیک لوگ''۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ میں فرمانِ خداوندی ہے: ﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ﴾ (آیت ۳۷) ''پس آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔'' لیکن یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ کلمات کیا تھے۔ جبکہ دوسری جگہ سورۃ الاعراف میں ان کلمات کی وضاحت فرما دی گئی: ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۖ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳﴾ ''ان دونوں (آدم وحوا) نے کہا کہ اے ہمارے ربّ! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' اور اگر آپ نے ہماری مغفرت نہ کی اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

سورۃ التوبہ میں فرمانِ ربانی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۱۹﴾ ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ''۔ یہاں یہ نہیں پتہ چلتا کہ سچے لوگوں سے مراد کون ہیں اور ان میں کون سی صفات پائی جاتی ہیں؟ لیکن سورۃ البقرۃ کی درج ذیل آیت اس کی پوری وضاحت کر دیتی ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ

السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

''نیکی صرف یہی نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو' لیکن (حقیقی) نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (آسمانی) کتابوں پر اور پیغمبروں پر یقین رکھے۔ اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور (قیدیوں یا غلاموں کی) گردن چھڑانے (آزاد کرانے) میں۔ اور نماز کی پابندی کرتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو۔ اور جو اشخاص اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے ہوں جبکہ وہ وعدہ (عہد) کرلیں' اور صبر کرنے والے ہوں تنگدستی میں اور بیماری میں اور جنگ کے وقت۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سچے ہیں' اور یہی وہ لوگ ہیں جو متقی ہیں۔''

(۲) ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کی دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی بات آیت کی ایک قراءت میں مبہم ہوتی ہے اور دوسری قراءت سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ المائدۃ' آیت ۶ میں وضو کا طریقہ بیان فرمایا گیا۔ اس آیت کی ایک قراءت اس طرح ہے: ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ﴾ عربی لغت کی رو سے اس کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''تم اپنے چہروں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرلو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولو''۔ اور یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ''اپنے سروں کا اور اپنے پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرلو''۔ جبکہ اس کی مشہور قراءت میں ''وَاَرْجُلِكُمْ'' کی بجائے 'وَاَرْجُلَكُمْ' آیا ہے اور اس قراءت میں اس کا اس کے سوا کوئی دوسرا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم اپنے پاؤں دھولو۔ اس قراءت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ پہلی قراءت میں بھی پاؤں دھونے کا ہی حکم دیا گیا ہے اور اس میں مسح کرنے کے ترجمہ کا امکان مراد نہیں ہے۔ اس طرح کی متواتر قراءتوں کی روشنی میں قرآن شریف کی جو تفسیر کی جائے وہ یقینی اور قطعی کے برابر شمار ہوتی ہے۔

مشہور قراءتوں سے اگرچہ علم یقینی تو حاصل نہیں ہوتا' پھر بھی علم تفسیر میں ان کو بڑی اہمیت حاصل ہے' البتہ شاذ قراءتوں کے بارے میں اہل علم کی آراء مختلف ہیں۔ بعض اہلِ علم انہیں تفسیر

میں کوئی اہمیت نہیں دیتے اور بعض انہیں 'خبر واحد' کے درجے میں قبول کرتے ہیں۔ بہرحال کسی قراءت کی صحت وقبولیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ حضور ﷺ سے بتواتر منقول ہو' اس کی سند صحیح ہو' نیز وہ عربیت کے قواعد اور عثمانی رسم الخط سے ہم آہنگ ہو۔ مشہور تابعی حضرت مجاہدؒ کی روایت سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی مختلف قراءتوں کو تفسیر کا ایک مرجع قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر قبل ازیں مَیں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت سے آگاہ ہوتا تو جو تفسیری سوالات مَیں نے ابن عباسؓ سے کیے تھے' ان کی ضرورت پیش نہ آتی (تاریخ تفسیر ومفسرین)۔

(۳) تفسیر القرآن بالقرآن کی تیسری صورت یہ ہے کہ جس آیتِ قرآنی کی تفسیر مطلوب ہو' خود اسی کے سیاق وسباق (context) پر غور کیا جائے۔ اس طرح سے بسا اوقات متعلقہ آیت کے کسی حل طلب مسئلے کی تشریح واضح ہو جاتی ہے' جیسے سورۃ الاحزاب میں اُمہات المؤمنین سے خطاب کرتے ہوئے فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾ (الاحزاب: ۳۳) ''اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق بے پردہ مت پھرو''۔ اصولِ شرعیہ سے ناواقف بعض لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ یہاں خطاب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے ہو رہا ہے' یہ دعویٰ کر دیا کہ پردے کا حکم صرف ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ ہی مخصوص ہے' دوسری عام عورتوں کے لیے اس پر عمل پیرا ہونا ضروری نہیں۔ لیکن قرآن مجید کا سیاق وسباق اس دعوے کی تردید کر رہا ہے۔ اسی آیت قرآنی سے پہلے اور بعد میں اُمہات المؤمنین سے خطاب کرتے ہوئے اور بھی کئی احکام مذکور ہیں' جیسے کہ بولنے میں نزاکت سے کام نہ لو' نیک بات کہو' نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو' نیز اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ اب ان احکامات میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کوئی معقول آدمی یہ کہہ سکے کہ یہ صرف ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ مخصوص ہے' اور دوسری خواتین کے لیے اس پر عمل کرنا لازم نہیں۔ لہٰذا ان بہت سارے احکام کے درمیان میں صرف ایک جملے کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ مخصوص ہے اور عام عورتوں کے لیے نہیں' یہ دوسری آیاتِ قرآنی' احادیث نبویؐ وغیرہ کے ساتھ قرآن کریم کے سیاق وسباق کے بھی بالکل خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے احکام تمام مسلمان عورتوں کے لیے ہیں اور یہاں خاص طور سے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو خطاب

صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ ان پر شرعی احکامات کی ذمہ داری زیادہ ہے' کیونکہ وہ دوسری عورتوں کے لیے نمونہ عمل ہیں' چنانچہ انہیں ان احکامات پر عمل پیرا ہونے کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

سورۃ الاحزاب' آیت ۵۳ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ﴾ ''(اور اے مسلمانو!) جب تم ان (اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن) سے کوئی چیز مانگو تو ان سے پردے کے پیچھے سے طلب کرو''۔ اس آیت کے بارے میں بھی بعض ناواقف اشخاص نے یہ سمجھ لیا کہ یہ حکم صرف ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ مخصوص ہے' حالانکہ اسی آیت قرآنی کا اگلا جملہ یہ وضاحت کر رہا ہے کہ اس حکم کا تعلق تمام عورتوں سے ہے' جیسے کہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ﴾ ''یہ طریقہ تمہارے لیے بھی اور اُن کے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزگی کا سبب ہے''۔ اب ظاہر ہے کہ دلوں کی یہ پاکیزگی صرف ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے ہی مطلوب نہیں' بلکہ تمام مسلمان عورتوں کے لیے مطلوب ہے اور اس حکم کو کچھ مخصوص خواتین کے لیے لازم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سورۃ الاحزاب میں ہی ایک مقام پر فرمانِ خداوندی ہے: ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے گندگی کو دُور کر دے اور تم کو خوب اچھی طرح سے پاک کر دے''۔ بعض عقل کے کورے لوگوں نے اس آیت کے بارے میں کہہ دیا کہ یہاں 'اہل بیت' سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے کے چند مخصوص لوگ ہیں' امہات المؤمنین اس میں داخل نہیں۔ لیکن قرآن مجید کا سیاق و سباق اس نظریہ کی واضح تردید کرتا ہے' کیونکہ اس آیت سے پہلے سلسلۂ کلام کا آغاز ہی ''يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ'' سے ہو رہا ہے اور بعد میں بھی تمام تر خطاب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے ہو رہا ہے' اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بذات خود 'اہل بیت' کے مفہوم میں داخل نہ ہوں؟ خاص طور پر اس سے اگلی آیت میں ارشاد ہو رہا ہے: ﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ﴾ (آیت ۳۴) ''تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیات اور (رسول کی جو) احادیث پڑھی جاتی ہیں' اسے یاد کرو''۔ اس آیت میں لفظ 'بُیُوت' نے وضاحت کر دی کہ پچھلی آیت میں ''اَهْلَ الْبَيْتِ'' کے مفہوم میں اُمہات المؤمنین تو سب سے پہلے داخل ہیں' انہیں اس آیت کے مصداق سے قطعاً الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ صرف چند مثالیں ہیں' ورنہ قرآن مجید میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر کے بہت سے حل طلب مسائل سیاق و سباق کو دیکھ کر ہی حل ہو جاتے ہیں۔ البتہ کبھی تو سیاق و سباق سے آیت قرآنی کی تفسیر اتنی واضح ہو جاتی ہے کہ اسے کوئی بھی معقول آدمی ردّ نہیں کر سکتا' ایسی تفسیر قطعی اور یقینی ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات سیاق و سباق کی مدد سے جو تفسیر کی جاتی ہے وہ اتنی واضح اور قطعی نہیں ہوتی' چنانچہ اسے قبول کرنے یا ردّ کرنے میں مجتہد علماء کی آراء مختلف ہو سکتی ہیں۔ بعض حضرات نے ایسی پوری تفاسیر بھی لکھی ہیں جن میں ہر آیت کی تفسیر کسی دوسری آیت سے کرنے کا التزام کیا گیا ہے۔ اس قسم کی ایک تفسیر علامہ ابن جوزیؒ نے لکھی ہے اور علامہ سیوطیؒ نے ''الاتقان'' میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

قرآن کریم کا قاری اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس میں ایجاز بھی ہے اور اطناب بھی' اجمال بھی ہے اور تبیین بھی' یہ مطلق و مقید اور عام و خاص سبھی کو شامل ہے۔ جو چیز ایک جگہ مختصراً بیان ہوئی ہے' دوسری جگہ تفصیلاً مذکور ہے اور جو ایک جگہ مجمل ہے' دوسری جگہ مفصل ہے۔ جو چیز ایک اعتبار سے مطلق ہے' وہ دوسری جگہ کسی اور پہلو سے مقید ہے' ایک آیت قرآنی میں جو چیز عام ہے' وہ دوسری آیت میں خاص ہے۔ اب جو شخص بھی قرآن پاک کی تفسیر کرنا چاہتا ہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک موضوع پر وارد ہونے والی تمام مکرر آیات کو جمع کر کے ان کا تقابل کرے۔ اس طرح مفصل آیات سے مجمل آیات کے سمجھنے میں مدد ملے گی اور مبین آیات کا فہم و ادراک مبہم کا مفہوم متعین کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ مطلق کو مقید پر اور عام کو خاص پر محمول کرے۔ یہی تفسیر القرآن بالقرآن ہے' اس سے تجاوز کرنا کسی مفسر کے لیے بھی روا نہیں' اس لیے کہ صاحب کلام سے بڑھ کر اور کوئی اس کے اسرار و رموز سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ (ا) اس کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جو واقعہ یا بات قرآن پاک میں ایک جگہ مختصراً آئی ہے' اس کی تفسیر ان آیات کے ساتھ کی جائے جہاں وہی مضمون تفصیلاً آیا ہے' جیسے آدم و ابلیس کا قصہ بعض جگہ مختصر آیا ہے اور دوسرے مقام پر تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ یہی حال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کا ہے۔ (ب) اس کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ مجمل کو متبین پر محمول کر کے اس کے ساتھ مجمل کی تفسیر کی جائے' مثلاً سورۃ المؤمن میں فرمایا گیا: ﴿وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ﴾ (آیت ۲۸) ''اور اگر یہ (رسول) سچا ہے تو جس عذاب کا وعدہ وہ

تم سے کرتا ہے‘ اس میں سے کچھ تمہیں ضرور پہنچے گا‘‘۔ آگے اسی سورت میں اس کی وضاحت میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ﴾ (آیت ۷۷) ’’جس بات کا وعدہ ہم ان سے کرتے ہیں‘ اگر اس میں سے کچھ آپ کو دکھا دیں‘‘۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے جس وعدے کا ذکر کیا گیا ہے‘ اس سے دنیوی عذاب مراد ہے۔ اسی طرح سورۃ النساء میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾﴾ ’’جو لوگ شہوات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بالکل ہی جھک جاؤ‘‘۔ اسی سورت کی ایک آیت میں اس کی وضاحت کر دی گئی کہ یہاں اہل کتاب کا ذکر کیا گیا ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾﴾ ’’کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا‘ وہ خود بھی گمراہی اختیار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ‘‘

(۴) تفسیر القرآن بالقرآن کے مندرجہ بالا طریقوں کے علاوہ یہ قسم بھی ہے کہ مطلق کو مقید اور عام کو خاص پر محمول کیا جائے۔ اول الذکر کے حوالے سے امام غزالیؒ نے اکثر شافعیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب دو حکم الگ الگ ہوں اور ان کا سبب ایک ہو تو پھر مطلق کو مقید پر محمول کیا جانا چاہیے‘ جیسے کہ سورۃ المائدۃ کی آیت وضو میں فرمایا گیا: ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ (آیت ۶) ’’اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لیا کرو‘‘۔ اس آیت قرآنی میں ہاتھ دھونے کی حد کہنی تک مقرر ہے۔ اسی آیت میں آگے تیمم کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ (آیت ۶) ’’اپنے چہروں اور ہاتھوں کو اس سے مل لو‘‘۔ اس آیت میں ہاتھ کی تحدید و تعیین نہیں کی گئی‘ لہٰذا اوپر کی آیت کے حوالے سے یہاں بھی ہاتھ کہنیوں تک مراد ہوں گے۔ عام کو خاص پر محمول کرنے کی مثال سورۃ البقرۃ کی یہ آیت ہے: ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ﴾ (آیت ۲۵۴) ’’اس سے قبل کہ وہ دن آئے جس روز نہ سودے بازی ہوگی‘ نہ کوئی دوستی اور نہ ہی سفارش‘‘۔ اب یہاں دوستی اور سفارش کی نفی بطریق عموم فرمائی گئی ہے۔ لیکن پھر سورۃ الزخرف میں متقیوں کو دوستی کی نفی سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے فرمانِ الٰہی ہے: ﴿اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۷﴾﴾ اُس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے‘

سوائے متقیوں کے‘‘۔ اسی طرح سورۃ النجم میں امر خداوندی پر مبنی سفارش کو استثناء دیا گیا ہے: ﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ﴾ (آیت ۲۶) ’’آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں جن کی سفارش کوئی فائدہ نہیں دیتی مگر اللہ کے حکم کے بعد‘‘

اسی کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ جو چیز بظاہر مختلف نظر آتی ہے‘ اس کو یکجا کر دیا جائے‘ جیسے تخلیقِ آدم کے حوالے سے بعض قرآنی آیات میں ذکر ہوا کہ ان کو تراب (مٹی) سے پیدا کیا گیا‘ بعض میں اس حوالے سے طین (کیچڑ) کا ذکر ہوا‘ نیز بعض میں صلصال (کھنکھناتی ہوئی مٹی) کا لفظ استعمال ہوا۔ ان بظاہر مختلف الفاظ و آیات میں جمع و تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ان میں تخلیقِ آدم کے مختلف مراحل اور ادوار کا ذکر کیا گیا ہے‘ جن سے وہ آغازِ تخلیق سے لے کر نفخ روح تک گزرے۔

یہ تفسیر القرآن بالقرآن کوئی سطحی کام نہیں جو کسی غور و فکر کا محتاج نہ ہو‘ یہ تو ایک ایسا عمل ہے جس کی اساس ہی تفکّر و تدبّر پر رکھی گئی ہے۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جسے ہر پڑھا لکھا شخص سرانجام دے سکتا ہو‘ بلکہ یہ ایک ایسا عظیم کام ہے جس سے متدین اہلِ علم ہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

(ب) دوسرا ماخذ‘ احادیث نبویہؐ

نبی کریم ﷺ کی احادیث کا شمار بھی تفسیر قرآن کے اہم ماخذ میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں کئی مقامات پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی اس دنیا میں بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپؐ اپنے قول و فعل سے آیاتِ قرآنی کی تشریح فرمائیں۔ سورۃ النحل میں ارشاد ربانی ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (آیت ۴۴) ’’اور ہم نے قرآن آپؐ پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپؐ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان فرما دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہیں‘‘۔ اسی سورت میں ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾ ’’اور ہم نے آپؐ پر کتاب (قرآن) نہیں اتاری مگر اس لیے کہ آپؐ لوگوں کو وہ باتیں کھول کھول کر بتا دیں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں‘ اور تاکہ یہ کتاب (الٰہی) ایمان والوں کے لیے ہدایت و رحمت کا سبب ہو‘‘۔ سورۂ آلِ عمران میں ربِ کائنات کا قول ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ

اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۶۴﴾

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا' جبکہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا' جو ان کے سامنے اُس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاک صاف بناتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت (قرآن اور حدیث) کی تعلیم دیتا ہے' اور اس سے پہلے وہ یقیناً کھلی گمراہی میں تھے''۔ سورۃ النساء میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰہُ ؕ﴾ (آیت ۱۰۵) ''بلاشبہ ہم نے آپؐ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری' تاکہ آپؐ لوگوں کے درمیان ان (ہدایات) کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپؐ کی مرکزِ نگاہ بنائی ہیں۔''

مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی میں خود کلام اللہ نے واضح فرما دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو دُنیا میں مبعوث فرمانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپؐ لوگوں کو قرآن کریم کی ہدایات و تعلیمات اور اس کے اسرار و معارف سے آگاہ کریں اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے طریقے سکھلائیں۔ اس طرح خود قرآن مجید سے ہی یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ کے اقوال و افعال تفسیر قرآن کا اہم ترین ماخذ ہیں۔ کوئی فہم و شعور سے عاری' عقل کا اندھا اور گمراہ شخص ہی اس کھلی سچائی سے انکار کر سکتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ''مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کی مانند ایک اور چیز بھی۔ عنقریب ایک سیر شکم آدمی مسند سے ٹیک لگائے یوں کہے گا کہ قرآن کا دامن تھامے رکھو' جو چیز اس میں حلال ہوا سے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام خیال کرو!'' (ابوداؤد)

یہاں نبی کریم ﷺ کا یہ قول کہ مجھے کتاب کی مانند ایک اور چیز بھی دی گئی ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے قرآن مجید کے ساتھ اس کی تشریح و توضیح بھی بارگاہِ ربانی سے عطا ہوئی ہے۔ بنابریں نبی کریم ﷺ کی بیان کردہ تفسیر قرآن بھی اسی طرح واجب التعمیل اور لازم القبول ہے' جس طرح قرآن کریم کے ظاہری تلاوت کیے جانے والے الفاظ۔ اس حدیث نبویؐ میں ایک دوسرے معنی کا بھی احتمال ہے' وہ یہ کہ وحی متلو کے علاوہ مجھے ایک باطنی وحی بھی عطا ہوئی ہے جو کہ غیر متلو ہے۔ اس کی تائید سورۃ النجم کی درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے: ﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ﴿۳﴾ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ﴿۴﴾﴾ ''وہ (ہمارا رسول) اپنی خواہشِ نفس سے کچھ نہیں بولتا' بلکہ وہ تو وحی ہے جو (ان پر) اتاری جاتی ہے''۔ مذکورہ بالا حدیث میں اس سنتِ نبویؐ کی مخالفت

سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے' جس پر آنحضرت ﷺ نے عمل فرمایا ہو مگر کلام اللہ میں اس کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ اسی تناظر میں امام اوزاعیؒ نے مکحولؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قرآن کو جس قدر سُنّت کی ضرورت ہے' سُنّت کو اس حد تک قرآن کی نہیں۔ اب آپ دیکھیں کہ حدیث کس کس طرح سے قرآن مجید کی تشریح و توضیح کرتی ہے۔

(ا) قرآن کریم میں جو آیات مجمل یا مشکل ہیں' حدیث ان کی وضاحت کرتی ہے' جو آیات عام ہیں ان کی تخصیص کرتی ہے اور جو مطلق ہیں' حدیث ان کو مقید کرتی ہے۔

(ا) بیان مجمل کی مثال یہ ہے کہ قرآن کریم میں نماز کا حکم دیا گیا مگر اس کی تفصیلات مذکور نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے نماز پنجگانہ کے اوقات' رکعات کی تعداد' شرائط اور کیفیات وغیرہ بیان فرمائیں۔ فرضیت زکوٰۃ کی وضاحت کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے زکوٰۃ کا نصاب' مدّت' شرائط وغیرہ بتائیں۔ قرآن کریم میں حج کو فرض قرار دیا گیا ہے' نبی کریم ﷺ نے شرائطِ فرضیت' اس کے مناسک اور دیگر احکامات کو واضح کیا۔ صحیح بخاری میں فرمانِ نبویؐ ہے: ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) ''تم نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔ نیز ((خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ)) ''مجھ سے اپنے احکام (حج) سیکھ لو''۔ عبداللہ بن مبارکؒ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک آدمی سے کہا: تم بے وقوف آدمی ہو' کیا قرآن میں یہ لکھا ہے کہ ظہر کے چار فرض ہوتے ہیں اور ان میں قراءت خاموشی سے ہوتی ہے؟ پھر اس سے باقی نمازوں نیز زکوٰۃ اور دوسرے احکام و مسائل کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا تم ان کو قرآن پاک میں تفصیلاً لکھا ہوا پاتے ہو؟ (پھر اس شخص کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ) قرآن نے ان سب امور کو مجمل طور سے مبہم صورت میں بیان کیا' حدیث نے ان سب کی (پوری طرح) وضاحت کر دی۔

(ب) حدیثِ نبویؐ سے تخصیص عام کی مثال یوں ہے کہ سورۃ الانعام میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ﴾ (آیت ۸۲) ''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہیں ملایا''۔ اس آیت میں ظلم کا لفظ عمومی لحاظ سے آیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سن کر متفکّر ہوئے اور پریشانی کے عالم میں حضور ﷺ کے پاس آئے کہ ہم میں سے کون ہوگا جس نے (کم و بیش) ظلم نہیں کیا؟ حضور ﷺ

نے ان کو تسلی دی اور فرمایا کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے‘ جیسا کہ سورۃ لقمان میں آیا ہے: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ⑬﴾ ”بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے“۔ اس طرح حضور اکرم ﷺ نے مندرجہ بالا آیت میں ظلم کے لفظ کو شرک کے ساتھ مخصوص کر دیا۔

(ج) تقیید مطلق کی مثال یہ ہے کہ سورۃ المائدۃ میں چور کی سزا کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ (آیت ۳۸) ”ان کے ہاتھ کاٹ دو“۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی توضیح کرتے ہوئے مطلق ہاتھ کو دائیں ہاتھ کے ساتھ مقید فرما دیا۔

(د) توضیح مشکل کی مثال اس طرح سے ہے کہ سورۃ البقرۃ میں روزے کے حوالے سے رات کو سحری کے کھانے پینے کی حد یوں مقرر کی گئی: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (آیت ۱۸۷) ”اور تم کھاتے پیتے رہو‘ یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے واضح ہو جائے“۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کی تشریح یوں کی کہ یہاں سیاہ دھاگے سے مراد ہے رات اور سفید دھاگے سے مراد ہے صبح صادق۔

(۲) تشریح قرآن کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ حضور اکرم ﷺ قرآن میں آنے والے الفاظ کی تشریح فرما دیا کرتے تھے‘ جیسا کہ سورۃ الفاتحہ کے حوالے سے آپؐ نے فرمایا کہ اس میں ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ ”جن پر تیرا غضب ہوا“ سے مراد یہودی اور ﴿الضَّآلِّيْنَ﴾ ”جو گمراہ ہوئے“ سے مراد عیسائی ہیں۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ میں ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ﴾ (آیت ۲۵) ”ان (مؤمنوں) کے لیے وہاں پاک بیویاں ہوں گی“۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کی تفسیر یوں فرمائی کہ جنت میں جو بیویاں ملیں گی‘ وہ حیض‘ تھوک اور ناک کی غلاظت سے پاک ہوں گی۔ ایک دوسرے مقام پر سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ (آیت) ”نمازوں کی حفاظت کرو اور بالخصوص درمیان والی نماز کی“۔ حضور ﷺ نے متعین فرما دیا کہ ’اَلصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى‘ سے مراد عصر کی نماز ہے‘ وغیرہ۔

(۳) تفسیر قرآن کا ایک انداز اس طرح سے بھی ہے کہ قرآن پاک میں جو حکم مذکور ہو‘ حدیث سے اس کی تائید مزید اور توضیح کی جائے‘ مثلاً سورۃ البقرۃ میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا

اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (آیت ۱۸۸) ”اور تم ایک دوسرے کے مال باطل اور ناروا طریقے سے مت کھاؤ“۔ فرمانِ نبویؐ میں اس کی تاکید اور وضاحت آ گئی کہ کسی مسلمان کے مال کا اس کی رضامندی کے بغیر استعمال حلال (جائز) نہیں ہے۔

(۴) قرآنی تفسیر کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کلام اللہ میں ناسخ و منسوخ آیات کی نشان دہی فرمائی‘ جیسے آپ ﷺ نے فرمایا کہ آیت وصیت اگرچہ قرآن پاک میں موجود ہے مگر اب شرعی وارثوں کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔ دوسروں کے لیے وصیت ہو سکتی ہے مگر آپؐ نے اس کی حد بھی ایک تہائی مقرر فرما دی۔

(۵) توضیح قرآن کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ حضور ﷺ نے ایسے احکامات لازم ٹھہرائے جو کہ قرآنی احکامات سے زائد تھے یا پھر اس میں مذکور نہیں۔ جیسے آپ ﷺ نے پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی سے بیک وقت نکاح کو ممنوع قرار دیا‘ شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے کا حکم دیا‘ وراثت میں دادی کا حصہ مقرر فرمایا‘ مقدمات میں دو گواہوں کی بجائے ایک گواہ اور حلف لینے کی بنیاد پر مدعی کے حق میں فیصلہ کرنے کا ارشاد فرمایا‘ وغیرہ۔

اس ضمن میں ایک حقیقت ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ احادیث نبویؐ کے موجودہ ذخیرے میں صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات ملتی ہیں‘ لہٰذا جو روایت جہاں مل جائے اسے مدِّنظر رکھ کر کوئی فیصلہ کر لینا درست نہیں‘ بلکہ اصولِ حدیث کے مطابق اسے اچھی طرح جانچنے کی ضرورت ہے کہ وہ ان اصولوں اور ضوابط کے مطابق ہے یا نہیں۔ خاص طور سے کتبِ تفسیر میں جو روایات ملتی ہیں‘ ان کی چھان پھٹک اس لیے زیادہ ضروری ہے کہ بیشتر مفسرین کرام نے اپنی کتابوں میں ہر طرح کی روایات صرف جمع کر دی ہیں‘ محدثانہ طریقے اور قواعد پر ان کی تحقیق و تفتیش کی بحث کو چھیڑا ہی نہیں گیا‘ اس لیے ان روایات سے ٹھیک ٹھیک استفادہ صرف وہی ماہر شخص کر سکتا ہے جو علم حدیث اور اس کے متعلقات پر گہری نظر رکھتا ہو اور جسے صحیح و سقیم روایات کو پرکھنے کے پورے اصول معلوم ہوں‘ ورنہ گمراہی اور فتنے کا خدشہ ہے۔

(ج) تیسرا ماخذ‘ اقوالِ صحابہ کرامؓ

وہ مبارک ہستیاں جنہوں نے براہِ راست آنحضرت ﷺ سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی‘ صحابہ کرام ؓ ہی ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات نے تو اپنی پوری زندگیاں ہی اس کام کے

لیے وقف کی ہوئی تھیں کہ قرآن کریم‘ اس کی تفسیر اور متعلقات کو براہِ راست حضور ﷺ کی ذاتِ مبارک اور آپؐ کے اقوال و افعال سے حاصل کریں۔ یہ حضرات اہلِ زبان بھی تھے اور نزولِ قرآن کے ماحول سے پوری طرح باخبر بھی‘ پھر بھی انہوں نے اپنی زبان دانی اور علم پر بھروسہ کرنے کی بجائے قرآن حکیم کو سبقاً سبقاً حضور ﷺ سے پڑھا اور سمجھا۔ مشہور تابعی ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ کا کہنا ہے کہ (صحابہ کرامؓ میں سے) جو حضرات قرآن حکیم کی تعلیم دیا کرتے تھے مثلاً حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ‘ انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ جب حضور ﷺ سے دس آیات سیکھتے تو اُس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے‘ جب تک کہ ان آیات کی تمام علمی و عملی باتوں کا علم حاصل نہ کرلیں (الاتقان)۔ مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے: كَانَ الرَّجُلُ اِذَا قَرَأَ الْبَقَرَةَ وَآلَ عِمْرَانَ جَدَّ فِيْ اَعْيُنِنَا ’’جب کوئی شخص (سمجھ کر) سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نظروں میں وہ بہت قابل احترام ہو جاتا تھا‘‘۔ اور موطا امام مالک میں روایت ہے کہ اَقَامَ ابْنُ عُمَر عَلٰى حِفْظِ الْبَقَرَةِ ثَمَانَ سِنِيْنَ ’’حضرت ابن عمرؓ آٹھ سال تک صرف سورۃ البقرۃ (سمجھ کر) یاد کرتے رہے‘‘۔ اب یہ ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایسے ضعیف الحافظہ تو تھے نہیں کہ سورۃ البقرۃ کے محض الفاظِ قرآنی یاد کرنے میں ان کو آٹھ سال لگ جاتے‘ یہ مدت صرف اس لیے صرف ہوئی کہ وہ الفاظِ قرآنی کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تفسیر اور جملہ متعلقات کا علم بھی حاصل کر رہے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے کہ اُس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں کہ کتاب اللہ کی کوئی آیت ایسی نازل نہیں ہوئی جس کے بارے میں مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس کے بارے میں اور کہاں نازل ہوئی۔ اور اگر مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ چلے جو کتاب اللہ کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہو اور سواریاں اس کے پاس پہنچا سکتی ہوں تو مَیں اس کے پاس ضرور جاؤں گا۔ متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سر پر ہاتھ پھیر کر ان کے لیے یہ دعا فرمائی: ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ)) ’’یا اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا فرما اور اس کو تفسیر قرآن کا علم عطا فرما‘‘۔ ان کے بارے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ آپؓ ہمارے نوجوانوں میں سے حسین تر‘ بااخلاق اور سب سے زیادہ کتابِ الٰہی کے سمجھنے والے ہیں۔ ابوالطفیل کا بیان ہے کہ مَیں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خطبہ دیتے

ہوئے دیکھا‘ وہ فرما رہے تھے کہ مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں سوال کیا کرو‘ کیونکہ خدا کی قسم! قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ یہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو‘ میدان میں اتری یا پہاڑ پر۔

تفسیر قرآن اور اکثر قرآنی آیات کے فہم و معرفت میں نزولِ قرآن کے اسباب اور واقعاتِ متعلقہ سے آگاہی (شانِ نزول) بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔ امام واحدیؒ کا قول ہے کہ جب تک کسی آیت کا واقعہ متعلقہ اور سببِ نزول معلوم نہ کرلیا جائے‘ اس کی تفسیر کا جاننا ممکن نہیں ہے۔ ابن دقیق العیدؒ کا کہنا ہے کہ سببِ نزول کا ذکر و بیاں قرآن کے معانی سمجھنے میں بڑی حد تک مددگار ثابت ہوتا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ تحریر کرتے ہیں کہ سبب نزول کی پہچان سے آیت کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے‘ اس لیے کہ سبب کے جان لینے سے مسبب کا علم حاصل ہو جاتا ہے (منہج الفرقان)۔ سورۃ البقرۃ کی آیت: ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ (آیت ۱۸۹) ’’اور یہ نیکی نہیں کہ تم گھروں کو پچھلی جانب (طرف) سے آؤ‘‘۔ نیز سورۃ التوبہ کی آیت: ﴿اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ﴾ (آیت ۳۷) ’’بے شک مہینوں کا آگے پیچھے کرنا کفر میں اضافے کا موجب ہے۔‘‘ مذکورہ بالا ہر دو آیات کا صحیح مفہوم اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے جبکہ نزولِ قرآن کے وقت عربوں کی عادات و اطوار سے واقفیت حاصل ہو۔

اسی طرح نزولِ قرآن کے وقت جزیرہ نمائے عرب میں جو یہود و نصاریٰ موجود تھے‘ ان کے احوال و کوائف سے آشنا ہونا اس لیے لازم ہے کہ اس سے ان آیاتِ قرآنی کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے جن میں اہلِ کتاب کے اقوال و افعال پر تنقید کی گئی ہے۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ قرآن پاک کی تشریح و توضیح کے لیے دورِ جاہلی کے حالات و واقعات کا علم ہونا بہت اہم ہے۔ اسی حوالے سے جاحظ کا قول ہے کہ جو شخص دورِ جاہلی کے حالات سے ناواقف ہے‘ وہ قرآن و حدیث کو صحیح طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر آیات کے شانِ نزول اور اسبابِ نزول سے اور کون زیادہ اور مستند طریقے سے واقف ہو سکتا ہے! اس حوالے سے تمام متعلقہ حالات اور واقعات ان کے سامنے تھے اور وہ اس کے عینی گواہ تھے۔ لہٰذا حضور اقدس ﷺ کی احادیث کے بعد تفسیر قرآن کا اہم ماخذ ان صحابہ کرامؓ کے اقوال ہیں جنہوں نے بڑی جانفشانی سے قرآن حکیم کی تفسیر آنحضرت ﷺ سے سیکھی اور آگے سکھائی۔ البتہ یہاں درج ذیل چند امور کو پیش نظر

رکھنا بہت ضروری ہے (الاتقان):

(۱) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تفسیری اقوال میں بھی صحیح وسقیم ہر طرح کی روایتیں ملتی ہیں‘ اس لیے ان اقوال کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے سے قبل اصولِ حدیث کے مطابق ان کی جانچ پڑتال لازم ہے۔

(۲) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اُس وقت حجت ہوں گے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلقہ آیت کی کوئی صریح تفسیر مستند طریقے سے ثابت نہ ہو۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیان کردہ کوئی تفسیر اس حوالے سے صحیح احادیث میں منقول ہو تو پھر صحابہ کرامؓ کے اقوال کی حیثیت محض تائیدی ہوگی۔ اور اگر صحابی کا کوئی قول آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیان کی ہوئی تفسیر سے معارض لگتا ہو تو ایسی صورت میں اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔

(۳) اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی تفسیر مستند روایات سے منقول نہ ہو اور اس حوالے سے صحابۂ کرامؓ کے بیان کردہ تفسیری اقوال میں کوئی اختلاف واقع نہ ہوتا ہو‘ تو ایسی صورت میں صحابہ کرامؓ کے اقوال کو ہی اختیار کیا جائے گا۔

(۴) جہاں صحابہ کرامؓ کے بیان کردہ تفسیری اقوال میں کوئی اختلاف ہو‘ تو ایسی صورت میں پہلے تو دیکھا جائے گا کہ ان مختلف اقوال میں کوئی تطبیق ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اگر باہم تطبیق اور ہم آہنگی ہوسکتی ہو تو پھر اسی پر عمل کیا جائے گا۔ دوسری صورت میں اگر باہمی اختلاف ناقابلِ تطبیق ہو اور ہم آہنگی نہ ہو پا رہی ہو‘ تو اس حالت میں ایک مجتہد جس قول کو شرعی دلائل کے لحاظ سے زیادہ قوی سمجھے‘ اسے اختیار اور قبول کرسکتا ہے۔

(۵) چوتھا ماخذ‘ اقوالِ تابعینؒ

تفسیر قرآن کے مآخذ میں تابعین کے اقوال کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان کے قبول یا عدم قبول کے حوالے سے علمائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے‘ اس لیے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ عظام رضی اللہ عنہم سے اس ضمن میں کچھ بھی صریحاً منقول نہیں۔ اس ضمن میں اکثر مفسرین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تابعین کے تفسیری اقوال قابلِ قبول ہیں‘ اس لیے کہ وہ صحابہ کرامؓ کے صحبت یافتہ ہیں اور فیض یافتہ بھی‘ اور ان کے زیادہ تر اقوال صحابہ کرامؓ سے ہی منقول ہیں۔ جیسے مشہور تابعی مجاہدؒ کا کہنا ہے کہ میں نے تین مرتبہ ابن عباسؓ کو قرآن سنایا‘ ہر آیت پر ٹھہر کر دریافت کرتا کہ یہ کیسے اور

کہاں نازل ہوئی۔ امام شعبیؒ کہا کرتے تھے کہ عکرمہؒ (تابعی) سے بڑھ کر کتاب اللہ کا عالم آج روئے زمین پر موجود نہیں۔ محمد بن کعب قرظیؒ (تابعی) کے بارے میں عون بن عبداللہؒ کا کہنا ہے کہ میں نے تفسیر قرآن کا ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ قتادہؒ کا بیان ہے کہ سب سے بڑے مفسّر قرآن سعید بن جبیرؒ (تابعی) تھے۔ قتادہؒ تابعی کا خود اپنے بارے میں کہنا ہے کہ قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کی تفسیر کے بارے میں کچھ نہ کچھ میں نے سنا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مفسرین نے تابعین کے اقوال اپنی تصانیف میں نقل کیے اور ان پر اعتماد کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ سے اس سلسلہ میں دو قول نقل کیے گئے ہیں‘ ایک میں تابعین کے تفسیری اقوال کو قابلِ قبول قرار دیا گیا ہے اور دوسرے میں اس کے برعکس کہا گیا ہے۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ تابعین کی تفسیر غیر مقبول ہے‘ ابن عقیل نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ اس قول کے قائلین یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ تابعین نے براہِ راست حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیض حاصل نہیں کیا‘ اس لیے صحابہ کے اقوال کی طرح ان کی آراء کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سماع پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ نیز تابعین نے بذات خود وہ ظروف واحوال ملاحظہ نہیں کیے جن میں قرآن مجید نازل ہوا تھا‘ اس لیے کچھ بعید نہیں کہ فہم مراد ومقصود میں ان سے غلطی صادر ہوئی ہو اور جو بات دلیل نہیں اس کو دلیل سمجھ لیا ہو۔ پھر تابعینؒ کی عدالت کے بارے میں کوئی نص بھی وارد نہیں ہوئی۔

اس ضمن میں دل کو لگتی بات تو یہ ہے کہ تابعی کا قول اسی صورت میں واجب الاحتجاج ہے جبکہ اس میں رائے کی گنجائش نہ ہو‘ اندریں صورت وہ قول اس شرط کے ساتھ قابلِ احتجاج ہوگا کہ شک وشبہ سے بالا ہو۔ اور اگر تابعی کے بارے میں یہ بات پختہ ہو جائے کہ وہ اہلِ کتاب سے حدود قیود کے بغیر زیادہ استفادہ کیا کرتا تھا تو پھر اس کی رائے نظر انداز بھی ہوسکتی ہے۔ البتہ جب کسی قول اور رائے پر تابعین کا اجماع منعقد ہو جائے تو پھر ہم اسے ترک کرکے کسی دوسرے قول یا رائے کو قبول نہیں کرسکتے۔ اس حوالے سے حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں بہترین محاکمہ کیا ہے۔ ان کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تابعی کوئی تفسیر کسی صحابی سے نقل کر رہا ہو تو اس کا حکم وہی ہے جو کہ صحابہ کرامؓ کی تفسیر کا ہے‘ اور اگر تابعی خود اپنا قول بیان کرے تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ دوسرے کسی تابعی کا قول اس کے خلاف ہے یا نہیں؟ اگر کوئی قول اس کے خلاف موجود ہو تو اس تابعی کا قول (اس وقت اور بعد میں بھی) حجت نہیں ہوگا‘ بلکہ اس آیت کی تفسیر کے لیے قرآن مجید‘ لغت عرب‘ احادیث نبویہ‘ آثارِ صحابہؓ

اور دوسرے شرعی دلائل پر غور کر کے کوئی فیصلہ کیا جائے گا' اور اگر تابعین (کے اقوال) کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو تو اس صورت میں بلاشبہ ان کی تفسیر (ہر دور میں) حجت اور واجب الاتباع ہوگی۔

اس حوالے سے علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اپنے مقدمہ اصولِ تفسیر میں اسی سے ملتے جلتے خیال کا اظہار کیا ہے۔

(۵) پانچواں ماخذ' لغتِ عرب

قرآن کریم کی جس آیت کا مفہوم بدیہی طور پر واضح ہو اور جس کے مفہوم میں کوئی الجھن' اشتباہ یا ابہام و اجمال نہ ہو' اور نہ ہی اسے سمجھنے کے لیے کسی تاریخی پس منظر کو جاننے کی ضرورت ہو' وہاں تو عربی لغت ہی علم تفسیر کا واحد ماخذ ہے۔ لیکن جہاں کوئی ابہام و اجمال پایا جا رہا ہو' یا جو آیت کسی واقعاتی پس منظر سے وابستہ ہو یا پھر اس سے فقہی احکام مستنبط کیے جا رہے ہوں' وہاں محض لغت کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں تفسیر کی اصل بنیاد تو خود قرآن کریم' سُنّت نبویؐ اور آثارِ صحابہ و تابعین پر ہوگی' لیکن ان مآخذ کے بعد لغت عرب پر بھی نظر ڈالی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی ایک وسیع زبان ہے' اس میں ایک ایک لفظ کئی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور ایک ایک جملے کے متعدد مفہوم ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا صرف لغت کی بنیاد پر ہی ان میں سے کوئی مفہوم متعین کرنا مغالطے سے آگے بڑھ کر گمراہی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ اسی بنا پر بعض مفسرین نے مطلق لغت کو مستقل ماخذ ماننے سے انکار کیا ہے۔ امام محمدؒ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ وہ محض لغت کے ذریعے قرآن مجید کی تفسیر کو مکروہ قرار دیتے تھے۔ البرہان میں علامہ زرکشیؒ کا کہنا ہے کہ ان (امام محمدؒ) کا مقصد تفسیر میں لغت کو بالکلیہ نظر انداز کرنا نہیں تھا' بلکہ مقصد یہ تھا کہ کسی آیت کے ظاہر اور متبادر معنی کو چھوڑ کر ایسے معانی بیان کرنا ممنوع ہے جو کہ قلیل الاستعمال اور دور از کار لغوی تحقیقات پر مبنی ہوں۔

ظاہر ہے قرآن کریم عرب کے عام محاورات کے مطابق نازل ہوا ہے' لہٰذا جس مقام پر قرآن و سُنّت یا آثارِ صحابہ میں کسی لفظ کی تفسیر موجود نہ ہو' وہاں آیت کی وہی تفسیر کی جائے گی جو اہلِ عرب کے عمومی محاورات میں متبادر (ظاہر) طور پر سمجھی جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر اشعارِ عرب سے استدلال کر کے کوئی ایسے قلیل الاستعمال معنی بیان کرنا بالکل غلط ہوگا جو لغت کی کتابوں میں تو لکھے ہوئے ہوں لیکن عام بول چال میں استعمال نہ ہوتے ہوں۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک واضح مثال پیش خدمت ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ذکر ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے

اللہ تعالیٰ سے پانی کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ ﴿اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ﴾ (البقرۃ: ۶۰) ''اپنی لاٹھی کو پتھر پر مارو''۔ یہ جملہ کسی بھی عربی زبان جاننے والے کے سامنے بولا جائے گا تو وہ صراحتاً اس کا یہی مطلب سمجھے گا کہ لاٹھی کو پتھر پر مارنے کا حکم دیا جا رہا ہے' چنانچہ اس جملے کی یہی تفسیر صحیح اور معتبر ہے۔ اب دیکھئے کہ صرف لغت عرب کو سامنے رکھ کر انسان کیسے گمراہ ہوتا ہے۔ سرسید احمد خان نے اپنی تفسیر میں لغت کے دور از کار حوالوں کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا کہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ ''اپنی لاٹھی کے سہارے اس چٹان پر چلو' یہاں 'اِضْرِبْ' کے معنی ''مارو'' کی بجائے ''چلو'' بیان کرنا ایسی زبردستی اور دھاندلی ہے جس کی تائید میں اگر لغت کی کتابوں کا کوئی ایک آدھا حوالہ مل بھی جائے تو عام محاوراتِ عرب اس کی بالکلیہ تردید کرتے ہیں۔ امام احمدؒ نے عربی لغت کے ذریعے اسی قسم کی تفسیر بیان کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے۔

ظاہر ہے لغت سے اس طرح کا کام لینے کو کوئی بھی سمجھ دار اور عدل و انصاف کو مدنظر رکھنے والا شخص قطعاً درست اور معقول قرار نہیں دے سکتا۔ البتہ ایک مخصوص دائرے کے اندر لغت عربی سے استفادہ کرنے کی روایت صحابہ کرامؓ سے بھی موجود ہے۔ الفاظ غریبہ (اجنبی) کے فہم و ادراک میں کئی اصحابِ رسولؐ قدیم عربی شاعری کی طرف رجوع کرتے اور لوگوں کو بھی ترغیب دلاتے۔ الموافقات کے مطابق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے سورۃ النحل کی اس آیت کے معنیٰ دریافت کیے: ﴿اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ﴾ (آیت ۴۷) ''یا انہیں ڈرا دھمکا کر پکڑے''۔ اس پر قبیلہ بنو ہذیل کا ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ ہماری زبان میں 'تخوف' کمی اور نقصان کو کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا عربی اشعار میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ اس شخص نے کہا: جی ہاں! اور فوراً ایک قدیم شعر سنا دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ اپنے دیوان کو تھامے رکھو' تم سے غلطی سرزد نہ ہوگی۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ دیوان سے کیا مراد ہے؟ آپؓ نے جواب دیا: ''جاہلی شاعری' اس میں قرآن کی تفسیر اور تمہاری زبان کے معانی موجود ہیں''۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ہی ایک اور قول منسوب ہے کہ 'الشعر دیوان العرب'۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس ضمن میں خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔ بسا اوقات ایسے ہوتا کہ آپ سے قرآن مجید میں استعمال ہونے والے کسی لفظ کے معنی پوچھے جاتے اور جواب میں آپؓ شعر پڑھ کر سنا دیتے جس میں وہ لفظ استعمال ہوا ہو۔ اس حوالے سے حضرت ابن

عباسؓ سے بکثرت اشعار منقول ہیں۔ امام سیوطیؒ نے ’الاتقان‘ میں نافع بن ارزق (خارجی) اور حضرت ابن عباسؓ کے درمیان ایک مناظرہ اور سوال و جواب کا تفصیلی ذکر کیا ہے جس میں کلامِ عرب سے استشہاد لازمی تھا۔ اسی مناظرے کے دوران نافع نے حضرت ابن عباسؓ سے سورۃ المائدۃ کی آیت ﴿وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ﴾ (آیت ۳۵) کے حوالے سے ’الْوَسِيْلَةَ‘ کا معنی پوچھا۔ آپ نے جواب دیا کہ ’الْوَسِيْلَةَ‘ حاجت اور ضرورت کو کہتے ہیں۔ نافع نے کہا کہ کیا عرب اس معنی سے آگاہ ہیں؟ تو حضرت ابن عباسؓ نے کہا: کیا آپ نے عنترہ کا یہ شعر نہیں سنا:

ان الرجال لهم اليک وسيلة ان يأخذوک تکحلی وتخضبی

اس شعر میں وسیلہ کا لفظ حاجت اور ضرورت کے لیے استعمال ہوا ہے۔

باہمی سوال و جواب کے اس سلسلے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما لغتِ عرب اور غریب الفاظ میں اس قدر مہارت رکھتے تھے کہ اس دور کا کوئی شخص ان کا حریف نہیں ہو سکتا تھا۔ تفسیر کے لغوی پہلو پر آپ کو خصوصی عبور حاصل تھا۔ ایسے ہی اوصاف کی بنا پر آپؓ امام التفسیر کہلائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آپؓ نے تفسیر قرآن کے لیے لغوی طریقہ اختراع کیا۔ علم تفسیر کے حوالے سے یہ لغوی طریقہ عہد تابعین تک معروف رہا۔ آگے چل کر اشعار کے کثرتِ استعمال کی وجہ سے فقہاء اور اہلِ لغت کے مابین ایک مباحثہ چلا۔ فقہاء کا کہنا تھا کہ تم نے (جاہلی) اشعار کو قرآن کی اساس بنالیا ہے۔ ان کا استدلال تھا کہ قرآن و حدیث میں اشعار کی مذمت ہوئی ہے تو پھر تفسیر میں اشعار سے احتجاج کیسے ہو سکتا ہے؟ حالانکہ اس دور کا یہ نزاع حقیقی بنیاد کے بغیر تھا۔ اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ صرف شعر کو ہی تفسیر قرآن کی اصل قرار دیا گیا ہے‘ بلکہ بات تو صرف اتنی ہے کہ قرآن پاک میں جو نادر اور غریب الفاظ وارد ہوئے ہیں‘ ان کی وضاحت جاہلی اشعار کی مدد سے کردی جاتی ہے۔ سورۃ الزخرف میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۳﴾ ’’ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا‘‘۔ اسی طرح سورۃ الشعراء میں فرمایا گیا: ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۱۹۵﴾ ’’واضح کرنے والی عربی زبان میں (قرآن اترا)‘‘۔ اسی بنا پر آج تک مفسرین کرام اس بات پر متفق ہیں کہ فہم قرآن کے ضمن میں متعینہ حدود و قیود کے اندر شعر جاہلی سے استشہاد کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

(و) چھٹا ماخذ‘ عقلِ سلیم

ویسے تو عقلِ سلیم کی ضرورت دنیا کے ہر کام کے لیے ہے اور پچھلے بیان کردہ مآخذ سے استفادہ بھی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن یہاں اس کو ایک مستقل ماخذ کے طور پر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کے اسرار و معارف ایک ناپیدا کنار سمندر کی حیثیت رکھتے ہیں‘ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ مذکورہ بالا پانچ مآخذ کے ذریعے اس کے مضامین کو بقدر ضرورت تو سمجھا جا چکا ہے‘ لیکن جہاں تک کلام اللہ کے اسرار و حکم اور حقائق و معارف کا تعلق ہے‘ اس کے بارے میں کسی دور میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب ان کی انتہا ہو گئی ہے اور مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے ان حقائق و اسرار پر غور و فکر کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے اور جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم حقیقی‘ عقل سلیم اور خشیت و انابت کی دولت سے نوازا ہو وہ کثرتِ تلاوتِ قرآن‘ اس پر غور و فکر اور تدبر کے ذریعے نئے نئے حقائق اور نکات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی تناظر میں حضرت علیؓ نے حضور ﷺ کی زبانی قرآن پاک کی عظمت وفضیلت پر ایک حدیث بیان کی ہے‘ جس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ)) ’’اور علم والے کبھی اس کے علم سے سیر نہیں ہوں گے اور وہ (قرآن) کثرتِ مزاولت (بار بار دہرانے) سے کبھی پرانا نہیں ہوگا اور اس کے عجائب (حقائق و معارف) کبھی ختم نہیں ہوں گے۔‘‘ (ترمذی)

اسی صلاحیت کی دعا آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے فرمائی تھی: ((اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ التَّاْوِيْلَ وَفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ)) ’’اے اللہ! اس کو تفسیر کا علم سکھا دے اور دین میں سمجھ عطا فرما‘‘۔ ایک دوسری روایت میں یوں دعا ہے: ((اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ)) ’’اے اللہ! اسے کتاب و حکمت سکھا دے‘‘۔ چنانچہ ہر دور کے مفسرین عظام اپنے اپنے فہم کے مطابق قرآن شریف کے حقائق و اسرار میں اضافہ کراتے آئے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ایک حقیقت ہمیشہ مدنظر رہنی چاہیے کہ اس طرح عقل سلیم سے مستنبط کیے ہوئے وہی اسرار و معارف معتبر اور قابلِ اعتماد ہیں جو دیگر شرعی اصولوں اور مندرجہ بالا پانچ مآخذ سے قطعاً متصادم نہ ہوں۔ اگر ان اصولِ شرعیہ اور مآخذ کو توڑ کر یا ان سے متصادم کوئی سے بھی نکات اور معارف بیان کیے جائیں‘ تو پھر دین کے حوالے سے ان کی بالکل بھی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ (جاری ہے) ۞

Nov 2021
Vol.70

Regd. CPL No.115
No.11

Monthly **Meesaq** Lahore

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے
سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہجِ انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر
مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل
اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک
اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ
کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

(جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن)

صفحات: 360 قیمت اشاعت خاص: 500 روپے اشاعت عام: 300 روپے

"منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

صفحات: 64 قیمت اشاعت خاص: 50 روپے اشاعت عام: 30 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501